پندرہ روزہ

چنگاری

دہلی

اگست [illegible]

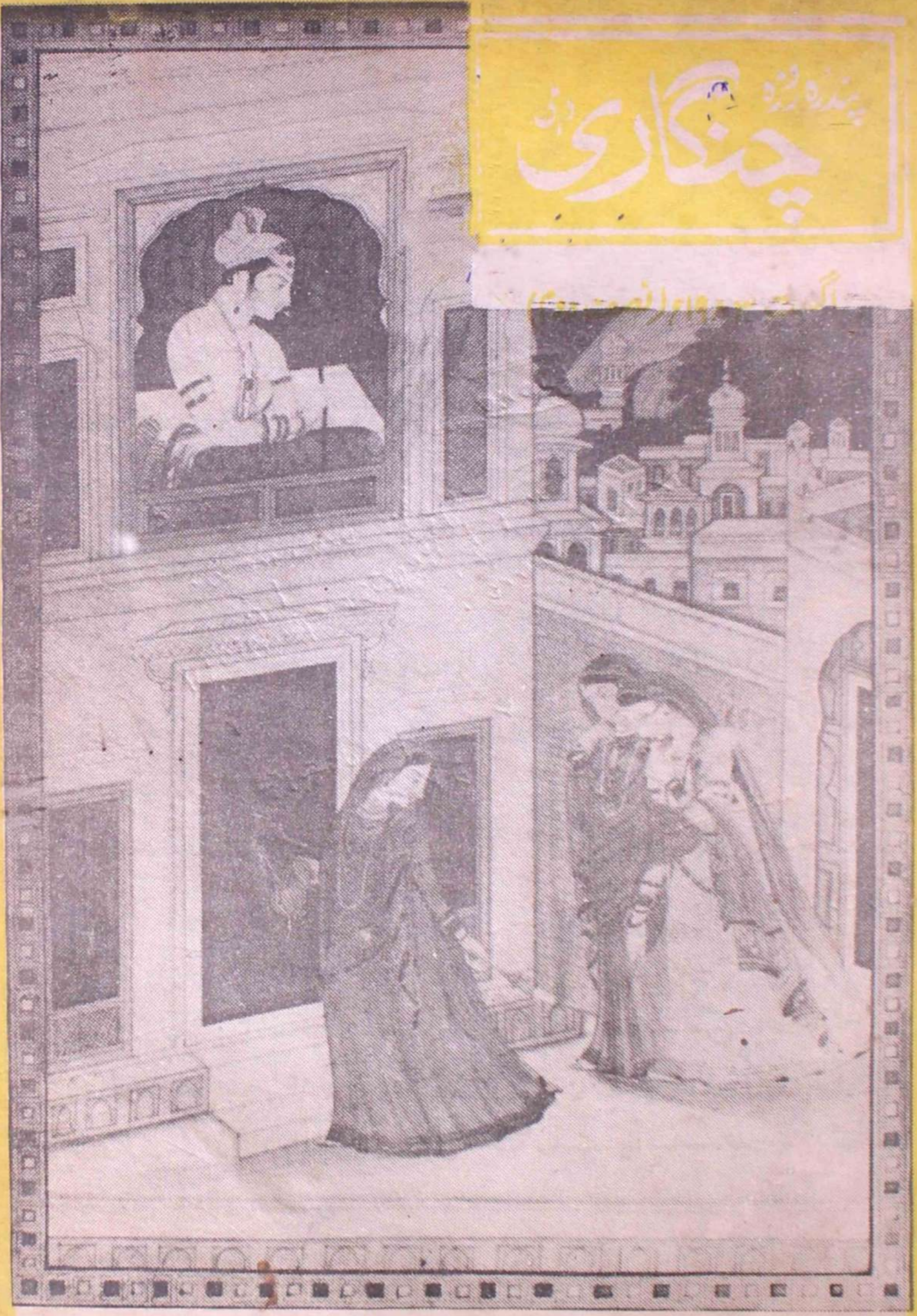

ایک خصوصی رعایت

- یکم اگست ۱۹۸۳ء سے ۳۰ ستمبر ۱۹۸۳ء تک چنگاری کی سالانہ خریداری قبول کرنے والوں کو پانچ روپئے کی خصوصی رعایت دی جائے گی۔ اس مدت کے دوران ۴۵ روپئے کی جگہ زرسالانہ صرف ۴۰ روپئے لئے جائیں گے۔
- اس طرح صرف ۴۰ روپئے میں گھر بیٹھے لگ بھگ ایک ہزار صفحات (۲۴ شمارے) آپ کو مل جائیں گے۔
- آپ جانتے ہیں چنگاری آفسیٹ پر چھپتا ہے اس لئے اس میں لیتھو کے صفحات سے تقریباً دوگنا مواد پیش کیا جاتا ہے۔
- زرسالانہ کی ادائیگی بذریعہ منیارڈر، چیک، یا ڈرافٹ ہو سکتی ہے۔ چیک، ڈرافٹ چنگاری دہلی کے نام ہونا چاہئے۔ انگریزی میں CHINGARI (FORTNIGHTLY) DELHI لکھ کر اسٹ کر دیں تو بہتر ہے۔
- اس مدّت کے دوران خریدار بننے والوں کو وہ تمام سہولتیں اور رعائتیں حاصل ہوں گی جو دوسرے خریداروں کو حاصل ہیں۔
- سالانہ خریداروں کو پابندی سے ہر مہینے کی ۲ اور ۱۴ تاریخ کو پرچہ پوسٹ کیا جاتا ہے اگر دس اور بیس تاریخ تک رسالہ نہ ملے تو مطلع کیجئے فوراً دوبارہ رسالہ بھیج دیا جائے گا۔
- چنگاری نہ صرف آپ کے ادبی اور جمالیاتی حس کی تسکین کرتا ہے بلکہ آپ کی اجتماعی اور تہذیبی زندگی کے تحفظ اور ارتقا میں بھی معاونت کرتا ہے۔ یہ آپ کے جذبے، ذوق اور ضرورت کی تکمیل کا باعث ہے۔

پندرہ روزہ چنگاری ۱۴۱۰/۳ - رام نگر شاہدرہ - دہلی ۳۲

پندرہ روزہ

چنگاری دہلی

ایڈیٹر

جمیلہ احمد

ادبی حصے کی ترتیب

بشیر احمد

انیس احمد خاں

شمارہ نمبر ——— ۲۴

قیمت :- ۲/ روپئے ——— سالانہ :- ۴۵ روپئے

پتہ :- ۳/۱۰/۱۴۱ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲

جمیلہ احمد ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے جے کے آفسٹ پرنٹرس جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر ۳/۱۰/۱۴۱ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲ سے شائع کیا۔

آئندہ شمارے کا ایک اہم مضمون

- قبولیت اسلام کے سرٹیفکٹ کی خرید و فروخت۔
- مذہبی قدروں کا استحصال
- عورتوں کے حقوق کی پامالی

اس شمارے میں

دامنِ نگاہ کا	خطوط	۲
نقد سخن		
اردو غزل کا نشاۃ ثانیہ اور مجروح سلطانپوری	ڈاکٹر راج بہادر گوڑ	۳
بزمِ ہستی		
بیں...	محمد طارق	۷
اپنی ماں سے کہو واپس آجائے	آمنہ ہمدم	۱۰
بخار	ممتاز قیصر شمیم	۱۳
تین ننھے افسانے	فضل امام ملک	۱۵
نقد حیات		
نسوانی پربشن، اگلا قدم	دیویندر اسر	۱۶
خواتین کا مشاعرہ	ہاجرہ بیگم	۱۸
غزلیں	قتیل شفائی	
"	مجروح سلطانپوری	
تین نظمیں	ظہیر غازیپوری	۲۱
حدیث دل		
سرفراز صدیقی		۲۲
سیدہ شان معراج، نعیم صدیقی، اقبال انصاری، راز اٹاوی		۲۳
علی احمد جلیلی، مہدی پرتاب گڈھی، جنوں اشرفی، مجیب الرحمٰن بزمی		
روشن لال بنارسی		۲۴
ادم کرشن راحت، خرم قیومی، اسرار حسین اسیر، وکیل نجیب		۲۵
سخن در سخن	خامہ بگوش	۲۶
فلمی دنیا کی کہانی	راوی شاہنواز	۲۹
خوانِ تکلم میں نمک		
من کہ قبلہ اردو	معین اعجاز	۳۵
تجربے کی زبان	کتابوں کی باتیں	۳۷

عزیزہ بہت بہت دعائیں

آپ کے جریدے کے لئے ایک مقالہ ارسال ہے۔ پتہ نہیں چنگاری کے صفحات اس کے لئے نکل سکیں گے یا نہیں۔ اگر کسی وجہ سے آپ اسے شائع نہ کر سکیں تو مجھے اطلاع ضرور دیجئے گا میں مسودے کی واپسی کے لئے ٹکٹ بھیج دوں گا۔

چند شعر جو آج سے دس سال پہلے سجاد ظہیر مرحوم کے انتقال کی خبر سن کر دل سے نکلے تھے وہ آپ کو بھیج رہا ہوں یہ اس سے پہلے کہیں شائع نہیں ہوتے۔ بس کہہ کر رکھ دیئے تھے۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۷۳ء وہ دن ہے جو ان کے ہزاروں چاہنے والوں کو ان کی یاد دلاجاتا ہے۔

خدا کرے چنگاری اسی طرح بہتر سے بہتر ہوتا جائے اور اردو میں پھر سے اچھے ادب کی تخلیق میں نمایاں کردار ادا کرے۔

علی عباس عزل

• • •

'چنگاری' رفتہ رفتہ سنِ بلوغت کو پہنچ رہا ہے اور اب ایک بھرپور رسالے کا مزہ دینے لگا ہے۔ 'خامہ بگوش' کا کالم سخن در سخن تو ایسی چیز ہے کہ جس کے لطف کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ اور سچ پوچھئے تو میں اس کالم کا اسیر ہو کر 'چنگاری' کے ہر شمارے کے لئے، وقت سے پہلے متعلقہ اسٹال کے چکر لگانا شروع کر دیتا ہوں۔

جولائی (نصف دوم) کے شمارے میں آپ نے یہ صحیح فرمایا ہے کہ کسی قسم کا استحصال نہیں ہونا چاہیئے۔ مذہبی استحصال یا مذہب کا استحصال تو اور بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ کسی کا کسی مذہب کو چھوڑ کر دوسرے مذہب کو قبول کر لینا، مذہبی استحصال کے زمرے میں کیسے آتا ہے۔

اگر مذہب کے پھیر بدل سے نارنگ صاحب کو درجات و مراتب ملے تو میرے خیال میں میناکشی پورم والے بھی اب تک درجات و مراتب سے مالا مال کر دیئے گئے ہوں گے۔

واقعی یہ بات حیرت میں ڈالنے والی ہے کہ اس ہندو اکثریتی ملک میں جہاں مسلمان دن رات اپنی زبوں حالی اور مظلومیت کا رونا روتے رہتے ہیں اتنا دم خم رکھتے ہیں کہ کسی غیر مسلم کے اسلام قبول کرنے پر اسے درجات و مراتب کے تاج پہنا سکتے ہیں۔

مذہبی جذبات کا استحصال برا تو ضرور ہے مگر آج کی تجارتی زندگی میں اسے جائز سمجھنے میں کوئی برائی نہیں۔

چنگاری جیسے رسالے میں نعتوں کی اشاعت کبھی تھا لیا مذہبی غلو میں مبتلا لوگوں کو اپنے رسالے کا قائل کرنے ہی کے لئے تو آپ نے روا رکھی۔

یہ نعت یہ منقبت اور فوٹو اسٹیٹ سندوں کے شائع کرنے کی نیکیاں یقینی رسالے کے لئے بڑی بابرکت ثابت ہوں گی۔

پرکاش فکری

• • •

'چنگاری' کے لئے دو نظمیں اور دو غزلیں ارسالِ خدمت ہیں۔ شاید کسی لائق ہوں۔ اگر 'چنگاری' کے معیار پر پوری اتریں تو شریکِ اشاعت کر لیں۔ ممنون ہوں گا۔

ادبی دنیا میں نووارد تو نہیں ہوں ... لیکن، یہ خوش فہمی مجھے کبھی نہیں رہی کہ لوگ مجھے جانتے ہوں گے — ذاتی طور پر نہ سہی تو کلام آشنا یا نام آشنا ضرور ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس لحاظ سے میری تخلیقات سے یہ آپ کا پہلا تعارف ہوگا۔

آشفتہ چنگیزی

• • •

چنگاری کی تخلیقات بہر حال معیاری ہوتی ہیں مگر ترتیب میں توازن نہیں ہے۔ ویسے ترتیب کا کام مشکل ہے مگر گہری ادبی و شعری بصیرت سے یہ توازن قائم کیا جا سکتا ہے۔ شمارہ ۲۱ میں بہت سی اچھی شعری تخلیقات کو بعد میں جگہ دی گئی ہے۔ سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ موجودہ دور کا سب سے بڑا شاعر فضا ابن فیضی جس کی شعری بصیرت اور شاعرانہ عظمت مسلم ہے، اسے پریم وار برٹنی جیسے تیسرے درجہ کے شاعر کے بعد نمبر دیا گیا ہے۔ اساتذہ اور صفِ اوّل کے شعراء کا احترام بھی ضروری ہے۔ اُمید ہے اس امر کی طرف خاص توجہ دیں گے۔

مشتاق شبنم

• • •

یوں بھی میں بہت کم لکھنے والوں میں سے ہوں۔ لیکن وعدہ کرتا ہوں کہ اگر "چنگاری" کے لائق کچھ لکھ سکا تو آپ کو روانہ کر دوں گا۔ ویسے عام طور پر میں بنگال کے سلسلے میں لکھا کرتا ہوں۔ وجہ صاف ہے۔ بنگال میں رہتا ہوں۔ یہاں کے حالات جتنا جانتا ہوں اتنا دہلی کے سلسلے میں جان نہیں سکتا۔ یعنی دلی میرے لئے دور ہے۔ اگر آپ بنگال کے سلسلے میں کوئی ادبی موضوع دیں تو اس پر لکھنے کی کوشش ضرور کروں گا۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

• • •

چنگاری کا شمارہ نمبر ۲۱ ملا۔ شکریہ۔ ممتاز مفتی۔ قتیل شفائی۔ فضا ابن فیضی — پریم وار برٹنی (مرحوم) ستیش بترا اور کے۔ کے کھلر جیسے بڑے نام ہی چنگاری کے اعلیٰ معیار کی توثیق کرتے ہیں اور کیا کہوں۔ پروفیسر محمد محسن صاحب بین الاقوامی شہرت کے ماہر نفسیات ہیں۔ ان کا مضمون رسالہ کی جان ہے۔ افسانہ "خون کی پکار" پر مصنف کا نام درج نہیں ہے۔ کے۔ کے کھلر صاحب کے مضمون میں کئی جگہ پر تنقیص کی بدبو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا — پروفیسر گوپی چند نارنگ کا نام لئے بغیر انھوں نے بے چاروں کی اچھی خاصی بخیہ ادھیڑ کر رکھ دی ہے۔ ایک بات نے دھکا پہنچایا کہ کھلر صاحب قلم کار ہونے کے باوجود غالب کا مصرعہ غلط لکھ گئے۔

راشد جمال فاروقی

اردو غزل کا نشاۃ ثانیہ اور مجروح سلطانپوری

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

اسرار حسن خاں۔ لیکن اصلی نام سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ یہ اور بھی کم لوگ جانتے ہوں گے کہ آپ راجپوت النسل ہیں۔ خاں لقب کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ عربی، فارسی کے علاوہ طب میں دسترس رکھتے ہیں، اور لوگ آپ کو مجروح سلطانپوری کے نام سے ہی جانتے ہیں۔

پتہ نہیں طب کے راستے آپ نے کتنوں کو ٹھکانے لگایا یا کتنوں کی جان بچائی۔ لیکن ادبی مورچہ پر یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ آپ نے غزل کے بڑے بڑے شہ زور منکرین کو چپ کر دیا اور ان کمزوروں کو بھی جو غزل پر حملوں کی تاب نہ لا کر کچھ مایوس ہو چلے تھے اور غزل کی کم مایگی کے شاکی ہو رہے تھے، غزل میں نئے میدانوں، میلانوں اور منزلوں کی نشان دہی کر کے ان کے حوصلے بڑھائے۔

ادب اور شاعری کے مورچے پر آپ اصلی راجپوت بھی ثابت ہوئے اور اچھے طبیب بھی۔

خواجہ الطاف حسین حالی نے بقول فراق "اپنے وقت کی رائج اور مقبول عام غزل گوئی سے اظہار برہمی کیا ہے اور ایسا کرنا ضروری تھا۔ امیر اور داغ کی عریانی میں زندہ دلی بھلے رہی ہو لیکن ساری غزل گوئی کو "آنچل اور محرم" کے لیے وقف کر دینا غزل کے ساتھ ناانصافی تو تھی ہی عشق کو بھی گھٹیا سطح پر لا کھڑا کرنا تھا۔

یہاں حسرت موہانی نے اردو غزل کو نئی لئے سے آشنا کیا۔ لئے شاید نئی نہ رہی ہو۔ کیوں کہ روایت آشنا دماغ جانتا ہے کہ حسرت نے اصل میں اردو غزل کو اس کی سابقہ عظمت لوٹا دی۔ معشوق کو معتبری بخشی اور عاشق کو رکھ رکھاؤ عطا کیا۔

لیکن ڈاکٹر عندلیب شادانی کی اس پر بھی تشفی نہیں ہوئی۔ اردو والوں نے اس دور کے جن پانچ غزل گو شاعروں کو (حسرت، اصغر، جگر، فانی اور فراق) امام مانا تھا، جنہوں نے اردو غزل کو ہذل کی سطح سے اوپر اٹھایا تھا۔ ان ہی کے خلاف عندلیب شادانی نے ۱۹۳۷ء سے "ماہنامہ ساقی" میں وہ مہم چلائی کی خدا کی پناہ۔ فراق نے اسی پر تو جھنجھلا کر "دور حاضر اور اردو غزل گوئی" کے عنوان سے جولائی ۱۹۳۷ء میں "رسالہ نگار" میں ایک مضمون لکھا۔

"یہ سمجھنا سخت گمراہی ہے کہ دور حاضر میں اردو نظم نے تو ترقی کی ہے لیکن اردو غزل محض جھک مار رہی ہے۔ اور قحبہ چوں پیر شود بپیشہ کند دلالی، کے مصداق بن رہی ہے۔"

ڈاکٹر عندلیب شادانی نے وار کیا—

"اس میں (غزل میں۔ راج) ایک بڑی سہولت یہ ہے کہ تھوڑی سی موزونی طبیعت سے غزلوں کا پورا دیوان تیار ہو جاتا ہے۔ نہ تخیل کی ضرورت نہ مشاہدہ و مطالعہ کی احتیاج۔ ہر قسم کے الفاظ و مضامین کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ کسی مخصوص وزن پر الفاظ جوڑ لئے اور غزل بن گئی۔ سننے والوں نے یار فروشی کی خاطر یا اپنی خوش فہمی کا ثبوت دینے کے لیے زبانی یا تحریر میں اس زور و شور سے واہ واہ کی کہ شعر کا صحیح ذوق رکھنے والے مبہوت ہو کر رہ گئے اور انھیں اپنی سلامت ذوق پر شبہ ہونے لگا۔"

یہاں اگر صرف الفاظ کے خوبصورت ڈھیر کو شعر سمجھنے سے انکار کرنا ہے تو صحیح ہے۔ لیکن حسرت، اصغر، جگر، فانی اور فراق پر یہ الزام تو نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

بات صرف اتنی نہیں تھی۔ معاملہ اس مقام سے آگے نکل چکا تھا جہاں حالی نے مورچہ لیا تھا۔ یہ ۱۹۳۶ء کے بعد کا زمانہ تھا اب تو پریم چند نے نئے افسانے کی نیو ڈال دی تھی۔ ہندوستان میں سامراج کے خلاف اور یوروپ میں فاشزم کے خلاف اور عالمی سطح پر سرمایہ داری ہی کے خلاف شوشلزم کا جہاد چل پڑا تھا۔ نثر و نظم دونوں ہی نے زندگی کے اس مجاہدانہ سفر میں انسان کی دستگیری کی تھی۔ ایسے میں غزل پر ایک نئے رویے سے اعتراض کیا جا رہا تھا۔ محض عشق خواہ وہ کتنا ہی صالح کیوں نہ ہو، زندگی کی واحد حقیقت تو نہیں تھا۔ اعتراض یہ تھا کہ تنگنائے غزل زندگی کے نئے مضامین کے اظہار کی متحمل نہ تھی۔ اس لیے ترقی پسندوں میں غزل سے انحراف اور نظم کی طرف بڑھنے کا زبردست رجحان تھا۔ خود جگر نے گھبرا کر کہدیا۔

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

دوسری طرف ایسے بھی لوگ تھے جو غزل کے اندر ہی روایت بھی اور روایت سے بغاوت کی رو بھی جاری و ساری دیکھتے تھے۔ خود فراق نے اپنے مضمون "غزل کی ماہیت و ہیئت" میں کہا—

"زندگی کے مرکزی اور اہم حقائق و مسائل غزل کے موضوع ہوتے ہیں۔ ان حقائق میں واردات عشق کو اولیت حاصل ہے،

کیوں کہ انسانی تہذیب کے ارتقاء میں جنسیت سے اور اس سے پیدا ہونے والی کیفیتوں کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ جنسیت نے اندھے طوفان کو توازن بخشا یعنی تہذیب جنسیت تاریخ کا بہت بڑا کارنامہ رہا ہے۔ ہم محبوب سے محبت کر کے اور محبت کو رچا سنوار کے اپنی زندگی کو رچاتے اور سنوارتے ہیں، حیات وکائنات سے محبت کرنا سیکھتے ہیں اور زندگی کی دھار کو کند ہونے سے بچاتے ہیں۔ غزل ہمیں جنسیت کی اہمیت کا احساس کراتی ہے اور جنسیت جب داخلی اور غیبی طریقوں سے عشق بن جاتی ہے تو اس عشق کے لامحدود امکانات کی طرف اس عشق کے ذریعہ سے تعمیر انسانیت کی طرف غزل اشارہ کرتی ہے۔ عشق کا پہلا محرک محبوب کی شخصیت ہے۔ پھر یہی عشق حیات وکائنات سے ایک ایسا والہانہ لگاؤ پیدا کر دیتا ہے کہ جنسیت کے حدود سے نکل کر عشق ایک ہمہ گیر حقیقت بن جاتا ہے۔

(فن اور تنقید۔ مرتبہ انور کمال حسینی ص ۱۹۷)

کسی اور مقام پر فراق ہی نے کہا ہے کہ عشق اپنے اعلیٰ مقام پر پہنچ کر "شعور، تحت الشعور اور لاشعور" کے درمیان کڑی بن جاتا ہے۔ عرفی نے غم عشق اور غم دنیا کے اسی ربط کو ایک اور انداز میں بیان کیا ہے۔

در دل ما غم دنیا، غم معشوق شود،
بادہ گر خام بود، پختہ کند شیشہ ما،

اسی بحث ...... کے پس منظر میں مجروح سلطانپوری کا شعری ذوق پروان چڑھ رہا تھا۔ غالباً وہ سنہ ۱۹۴۰ء ہی سے شعر کہتے تھے۔ بسنہ ۱۹۴۱ء میں ان کے ان اشعار سے

اللہ رے وہ عالم رخصت کے دیر تک
تکتا رہا ہوں یوں ہی تری رہ گذر کو میں
یہ شوق کامیاب، یہ تم، یہ فضا، یہ رات
کہدو تو آج روک دوں بڑھ کر سحر کو میں

سنہ ۱۹۴۱ء کے اس شعر کا مقابلہ کیجیے۔

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں، وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا، چراغ راہ میں جل گئے

تو اس سفر کا پتہ چلے گا جو مجروح کے ساتھ اردو غزل نے شروع کیا تھا۔ یہاں عرفی کے شعر کی تصدیق ہوتی ہے۔ مجروح کے دل کے شیشے میں غم عشق کی شراب خام، غم زندگی کی آگ میں تپ کر مئے دو آتشہ بن جاتی ہے۔ یہ وہ منزل ہے جب معشوق کا ہاتھ مل جاتا ہے تو زندگی کی تاریک راتوں میں امید کے چراغ جل اٹھتے ہیں۔

آپ ہی کہیے! کیا مجروح نے اس نئے دور میں غزل کو اس مقام سے آگے نہیں لایا جہاں حسرت نے چھوڑا تھا؟ غزل کی پرانی علامتوں کو نئے معنوں سے آشنا کر دینا کیا ایک اہم کارنامہ نہیں ہے؟ غالب نے ہرگوپال تفتہ کے نام اپنے ایک خط میں کہا تھا۔ "وہ شاعری معنی آفریں ہے۔ قافیہ پیمائی نہیں"۔ اور اگر ردیف اور قافیہ شعر کو غنائیت بخشتے ہیں تو کیا شعر کو معنی زندگی کی کشمکش سے نہیں ملتے؟ پھر یہ زندگی تو کشمکش مسلسل بھی ہے اور ہر دور میں نئی بھی۔ یہی نیا پن اس دور کو انفرادیت بخشتا ہے۔ اسی لیے غزل کی علامتیں بھی ہر دور میں ایک نئے معنی اور ایک نئی انفرادیت چاہتی ہیں۔

میر کے بارے میں ایک نقاد نے کہا ہے کہ "اگر غم کے شاعر نہ ہوتے تو اپنے زمانہ کے ساتھ دغا کرتے"۔ جاں نثار اختر نے کہا۔ میر کا راز اسی میں ہے کہ انھوں نے غم کو ایک ایسا لہجہ دیدیا جس میں صرف تحمل اور تاب و مقاومت ہی نہیں زندگی کی ایک نئی قوت بھی چھپی ہے"

پھر درد کے تصوف کا تجزیہ کرتے ہوئے جاں نثار اختر نے کہا "اس فکری نظام کے زیر اثر درد کی شاعری میں انسان دوستی کے عناصر موجود ہیں ...... لیکن اکثر وہ اپنے صوفیانہ طرز فکر کو غم دوراں سے بچنے کے لیے پناہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں"

غم روزگار سے بھاگ کر غم عشق میں پناہ لینا بھی ہمیشہ ممکن نہیں۔ آل احمد سرور نے کہا ہے۔

"پہلے شاعر غم روزگار سے بھاگ کر غم
عشق میں پناہ لے لیتا تھا لیکن
سماجی اور سیاسی حالات اور معاشی
الجھنوں نے اس دور کے ذہن
کی اس طرح پرداخت کی ہے کہ
یہ پناہ ناکافی ہو گئی ہے"

غزل کے اسی پناہ گاہ سے بھاگ نکلنے اور شاہراہوں پر انسانوں کے مصروف قدموں کے ساتھ قدم ملا کر چل پڑنے کا نام ہی مجروح سلطانپوری ہے۔

مجروح نے اردو غزل کی جو خدمت کی ہے اور غزل کو ارتقار کی جن منزلوں سے آشنا کیا ہے ان کا احاطہ نہایت مشکل ہے لیکن سال بہ سال ان کی غزلوں کے اشعار کو دیکھ کر ہم کچھ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ جس شاعر نے سنہ ۱۹۴۱ء میں یہ خالص رومانی شعر کہے —

کس کس کو ہائے تیرے تغافل کا دوں جواب
اکثر تو رہ گیا ہوں جھکا کر نظر کو میں

وہ سنہ ۱۹۴۳ء سے کچھ یوں کہنے لگتا ہے۔

جس شوخ نظر کی محفل میں آنسو بھی تبسم بن جائے
واں شمع جلائی جائے گی، پروانے کا ماتم کیا ہوگا

سنہ ۱۹۴۴ء —

کہیں ظلمتوں میں گھر کر ہے تلاش دست رہبر
کہیں جگمگا اٹھی ہیں مرے نقش پا سے راہیں

وہ زمانہ یاد کیجیے۔ ہندوستانی رہنما جیل میں بند ہیں۔ ملک ایک بدحالی کا شکار ہے۔ اور ادھر دنیا سرخ فوج کی جوانمردی کے افسانے سن رہی ہے۔ ہٹلر کی شکست کا آغاز ہو چکا ہے۔ تب اس شعر کے تہ در تہ معنی آپ پر آشکار ہوں گے۔

بچا لیا مجھے طوفاں کی موج نے ورنہ
کنارے والے سفینہ میرا ڈبو دیتے

سنہ ۱۹۴۵ء —

تبسموں نے نکھارا ہے کچھ تو ساقی کے
کچھ اہل غم کے سنوارے ہوئے ہیں میخانے
شب انتظار کی کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی
کبھی اک چراغ بجھا دیا، کبھی اک چراغ جلا دیا
شمع بھی اُجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا
میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی راہی بھی

سنہ ۱۹۴۶ء —

یہ ذرا دور پہ منزل، یہ اجالا یہ سکوں
خواب کو دیکھ ابھی خواب کی تعبیر نہ دیکھ
دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

سنہ ۱۹۴۷ء —

ہزاروں ماہتاب آئے ہزاروں آفتاب آئے
مگر ہم دم! وہی ہے ظلمتِ خانہ برسوں سے
وہی مجروح سمجھے سب جسے آوارۂ ظلمت
وہی ہے ایک شمع سرخ کا پروانہ برسوں سے
ہم تو پائے جاناں پر کر بھی آئے اک سجدہ
سوچتی رہی دنیا کفر ہے کہ ایماں ہے
مسرت ہو کہ غم، سب سے گذرتا جا رہا ہوں میں
غم دوراں سلامت اب سدھرتا جا رہا

سنہ ۱۹۴۸ء —

تقدیر کا شکوہ بے معنی، جینا ہی تجھے منظور نہیں
اب اپنا مقدر بن نہ سکے، اتنا تو کوئی مجبور نہیں
سنتے ہیں کہ کانٹے سے گل تک ہیں راہ میں لاکھوں ویرانے
کہتا ہے مگر یہ عزم جنوں صحرا سے گلستاں دور نہیں
جفا کے ذکر پہ تم کیوں سنبھل کر بیٹھ گئے
تمہاری بات نہیں بات ہے زمانہ کی
میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

سنہ ۱۹۴۹ء —

وہ جس کے گداز محنت سے پرنور شبستاں ہے تیرا
اے شوخ اسی بازو پہ تری زلفوں کو پریشاں ہونا تھا
آیا ہے ہمارے ملک میں بھی اک دور زلیخائی یعنی
اب وہ غم زنداں دیتے ہیں جنکو غم زنداں ہونا تھا

اب کھل کے کہوں گا ہر غم دل، مجروح نہیں وہ وحشت کہ جس
اشکوں میں سناتا تھا تجھکو، آہوں میں غزل خواں ہوتا تھا
میں کہ اک محنت کش، میں کہ تیرگی دشمن
صبح نو عبارت ہے میرے مسکرانے سے
زنجیر و دیوار ہی دیکھی تم نے مجروح مگر ہم
کوچہ کوچہ دیکھ رہے ہیں عالم زنداں تم سے زیادہ

سنہ ۱۹۴۹ء میں جب آزاد ہندستان میں غلامی کی توسیع کا نظارہ پیش ہو رہا تھا تب ہی مزدوروں کے ایک جلسے میں مجروح نے اپنے رنگ سے بالکل ہٹ کر "سو سنار کی تو ایک لوہار کی" کے مصداق جب ایک نظم سنائی۔

امن کا جھنڈا اس دھرتی پر کس نے کہا لہرانے نہ پائے
یہ بھی کوئی ہٹلر کا ہے چیلا، مار لے ساتھی جانے نہ پائے

تو مزدوروں نے تالیوں کی گونج میں اس کا خیر مقدم کیا۔

ادب کے اکثر ٹھیکہ داروں نے اسے بہانہ بنا کر ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی خوب ہوا اڑائی گویہ نئے ادب کا نیا معیار تھا۔

اور مرارجی ڈیسائی نے جو بمبئی کے وزیر اعلیٰ تھے، اسی نظم پر مجروح کو پکڑ کر جیل میں ٹھونس دیا۔

مجروح کی اپنی ڈگر سے ہٹی ہوئی سہی ایک نظم کے یہ تین رد عمل تھے۔ اور تینوں ہی ہماری سماج کے تین عناصر کی نمائندگی کرتے تھے۔

"چکی کی مشقت" نے حسرت پر جو رنگ چڑھایا وہی کام "جیل" نے مجروح پر کیا ہوگا چنانچہ جیل سے مجروح نے کچھ یہ شعر لکھ بھیجے

سنہ ۱۹۵۱ء —

دست منعم میری محنت کا خریدار سہی
کوئی دن اور میں رسوا سر بازار سہی
پھر بھی کہلاؤں گا آوارۂ گیسوئے بہار
میں ترا دام خزاں لاکھ گرفتار سہی
جست کرتا ہوں تو اڑ جاتی ہے منزل سے نظر
حائل راہ کوئی اور بھی دیوار سہی

سیر ساحل کر چکے اے موج دریا سر نہ مار
تجھ سے کیا بہلیں گے طوفانوں کے بہلائے ہوئے
ہر تیغ اثر زنجیر قدم، پھر بھی ہیں نقیب منزل ہم
زخموں سے چراغ راہ گذر بیٹھے ہیں جلائے زنداں میں
مجرم تھے جو ہم سو قید ہوئے صیاد مگر اب یہ تو بتا
ہر وقت یہ کس کو ڈھونڈھتے ہیں دیوار کے سائے زنداں میں
سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ
شب ظلم نرغہ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے
میں فراز دار سے دیکھ لوں کہیں کاروان سحر ہو
جنون دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

سنہ ۱۹۵۲ء سے ہندستان کے لیل و نہار کچھ بدلے بدلے سے ہیں۔ ہندستان کا اپنا ایک آئین ہے۔ پارلیمنٹ ہے۔ چناؤ ہیں۔ اب زندگی کی کشمکش کے تیور اور ہیں۔

مجروح نے پھر شعر میں اس نئے پن اور اس نئے دور کی انفرادیت کو ڈھال لیا۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں یوں کہتے ہیں:۔

دل سے ملتی تو ہے اک راہ کہیں سے آگر
سوچتا ہوں یہ تیری راہ گذر ہے کہ نہیں
روئے مشرق کی قسم ہم کو ہے اتنا معلوم
شب دوراں تیرے پہلو میں سحر ہے کہ نہیں
میں جو کہتا تھا سوائے رہبر کوتاہ خرام
تیری منزل بھی مری گرد سفر ہے کہ نہیں

"کوتاہ خرام" ترکیب پر غور فرمایئے اور ایسے ہی "رہبر" کی "منزل" مجروح کے سفر کی گرد ہی تو ہے:

سنہ ۱۹۵۴ء

خدا کرے غم گیتی کا پیچ و تاب اے دوست
کچھ اور بھی تیری زلفوں کو تابدار کرے
اہل طوفاں آؤ، دل والوں کا افسانہ کہیں
موج کو گیسو، بھنور کو چشم جاناں نہ کہیں
یار نکتہ داں کدھر ہے پھر چلیں اس کے حضور
زندگی کو دل کہیں یا دل کو دیرانہ کہیں
پارۂ دل ہے وطن کی سرزمیں مشکل یہ ہے
شہر کو ویراں کہیں یا دل کو دیرانہ کہیں

۱۹۵۹ء کے آتے آتے مجروح یوں کہتے ملے:
کھلے جو ہم تو کسی شوخ کی نظر میں کھلے
رہے گرہ تو کسی زلف کی شکن میں رہے
اور اب مجروح کی غزل آپ سے یوں مخاطب ہوتی ہے :-

بچاتے پھرتے آخر کب تلک دست عزیزاں سے
اسی کو سونپ کر ہم تو کلاہ نام و ننگ آئے
اُکتا کے ہم نے توڑی تھی زنجیر نام و ننگ
اب تک فضا میں ہے وہی جھنکار دیکھئے
برقِ تپیدہ، بادِ صبا، شعلہ اور ہم
ہیں کیسے کیسے اس کے گرفتار دیکھئے
اس باغ میں وہ سنگ کے قابل کہا نہ جائے
جب تک کسی ثمر کو میرا دل کہا نہ جائے
میرے ہی سنگ خشت سے تعمیر بام و در
میرے ہی گھر کو شہر میں شامل کیا نہ جائے
جس ہاتھ میں ہے تیغ جفا اس کا نام لو
مجروح سے تو سائے کو قاتل کہا نہ جائے

مجروح کے فنکار ہاتھوں میں غزل کی روایتی علامات اپنے نئے عصری مفہوم کے ساتھ ابھرتی ہیں اور جس مضمون کو بھی وہ ہاتھ لگاتے ہیں اسے جاوداں بنا دیتے ہیں :-

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

مجروح روایت کے منکر نہیں لیکن روایت کے قیدی بھی نہیں، روایت کو عصریت بخش کر اس میں تازگی پیدا کرنا اور اس راستے روایتی علامتوں کو نئی زندگی اور نئی اظہاریت عطا کرنا، یہ مجروح کا کارنامہ ہے :
ہم روایات کے منکر نہیں لیکن مجروح
سب کی اور سب سے جدا اپنی ڈگر ہے کہ نہیں

معیار دہلی کا
نیا پاکستانی ادب نمبر
مرتب :۔ شاہد ماہلی
قیمت :۔ چالیس روپے
چنگاری کے خریداروں کو خاص رعایت
چنگاری ۳/۱۰/۱۴ ارام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲

غزلیں

وہ تو گیا، یہ دیدۂ خونبار دیکھئے
دامن پہ رنگِ پیرہن یار دیکھئے
دِکھلا کے وہ تو لے بھی گیا شوخی خرام
اب تک ہیں رقص میں در و دیوار دیکھئے
اُکتا کے ہم نے توڑی تھی زنجیر نام و ننگ
اب تک فضا میں ہے وہی جھنکار دیکھئے
سینے میں چھپ گیا ہے طلوعِ سحر کے ساتھ
اب شاخِ دل پہ وہ گل رخسار دیکھئے
برقِ تپیدہ، بادِ صبا، شعلہ اور ہم
ہیں کیسے کیسے اُس کے گرفتار دیکھئے
پہلے بھی نیز رَد تھے پر اس دلنشیں کیا تھ
یہ چشمِ نم یہ مستیٔ رفتار دیکھئے
مجروح کے لبوں سے یہ خوشبو نہ جا سکی
بخشی جو اس نے دولتِ بیدار دیکھئے

اِس باغ میں وہ سنگ کے قابل کہا نہ جائے
جب تک کسی ثمر کو مرا دل کہا نہ جائے
شاخوں پہ نوکِ تیغ سے کیا کیا کھلے ہیں پھول
اندازِ لالہ کاری قاتل کہا نہ جائے
یہ خارِ شوخ رنگ ہیں کس کے لہو کے رنگ
کیا گل کتر گئی رہِ منزل کہا نہ جائے
یاراں منتظر ہیں سمندر پہ تشنہ لب
احوالِ میزبانی ساحل کہا نہ جائے
میرے ہی سنگ و خشت سے تعمیر بام و در
میرے ہی گھر کو شہر میں شامل کہا نہ جائے
ہم اہل عشق میں نہیں حرف گنہ سے کم
وہ حرف شوق جو سر محفل کہا نہ جائے
جس ہاتھ میں ہے تیغ جفا اس کا نام لو
مجروح سے تو سائے کو قاتل کہا نہ جائے

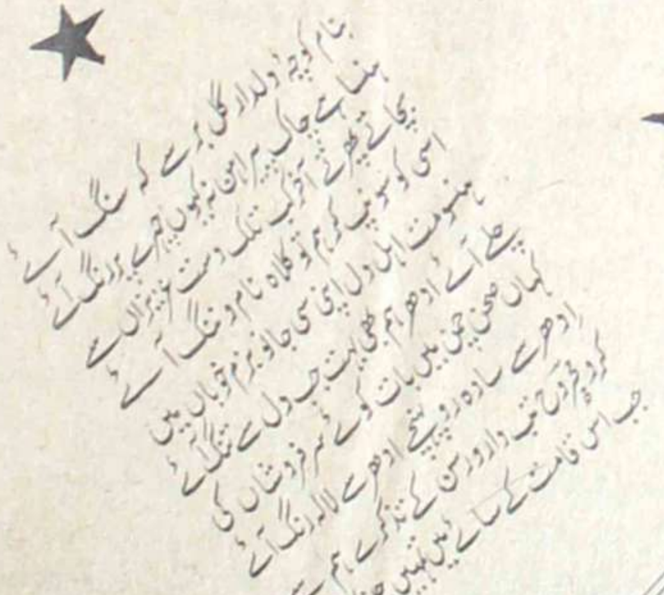

مجروح سلطانپوری

افسانہ

میں....

محمد طارق

سورج آگ برسا رہا تھا۔ زمین بھڑکتے ہوئے چولہے پر رکھے گرم توے کے مانند تپ رہی تھی گرم سنسناتی ہوئی تیز ہوائیں جگہ جگہ دائرہ بناتے ہوئے درختوں کے سوکھے پتے، زمین کی گرد اور کوڑا کرکٹ کو آسمان کی طرف لے جا رہی تھی .... فضا دھندلا سی گئی تھی آسمان میں سوکھے پتے کوڑا کرکٹ ناچ رہے تھے ہوا کی سنسناہٹ بند ہوتے ہی سوکھے پتوں اور کوڑا کرکٹ کا ناچ بھی بند ہو جاتا ہے وہ زمین پر لرزتے ہوئے گر پڑتے ہیں۔

سنسناتی ہوئی ہوائیں اپنے اس فعل کا بار بار اعادہ کر رہی تھیں.....

— میں سوچ رہا تھا تند ہوا مجھے بھی اپنے دائرہ میں لے کر اوپر لے جائے۔ آسمان کی وسعتوں میں اور اس زور سے مجھے پٹخے کر میرے پرخچے اڑ جائے میرا وجود ریزہ ریزہ ہو کر کائنات میں بکھر جائے، میں یہ بھی سوچ رہا تھا۔ ہوا مجھے اپنے مضبوط شانوں پر اٹھا کر اس زور سے آسمان کی طرف اچھالے کہ زمین کی کشش مجھے اپنی طرف نہ کھینچ سکے میں نیلگوں آسمان میں روپوش ہو جاؤں اس کی وسعتوں میں کھو جاؤں....

.... عجیب عجیب خیالات ذہن میں آ رہے تھے .... زمین کا سینہ شق ہو جائے اور اس میں سب کچھ سما جائے زمین کی سطح پر بکھری ہوئی یہ بے ترتیب غیر مساوی دنیا!

جب میں گھر سے نکلا تھا تب میرے ذہن میں ایسا کوئی خیال نہ تھا۔ یہ میرے اطراف پھیلے ہوئے ماحول کا اثر ہے

— میں گھر سے کب نکلا تھا مجھے معلوم نہیں.... مجھے کچھ بھی نہیں یاد آ رہا ہے وقت کے متعلق ہاں میں اتنا ضرور بتا سکتا ہوں گھر سے نکلنے سے قبل میں نے دریچہ سے جھانک کر ماحول کا اندازہ لگایا تھا ماحول بڑا خوشگوار دکھائی دیا تھا مجھے.... لیکن گھر سے کچھ دور چلنے کے بعد ہی مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ میرا اندازہ غلط ہے

میرے اطراف کا ماحول مکمل سراب ہے ماحول وہ نہیں جو نظر آ رہا ہے ماحول وہ ہے جو میں محسوس کر رہا ہوں سورج کی کرنوں میں ملائمت نہیں ہے تلخ چبھن ہے نیزے کی طرح نوکیلی برچھیوں کی طرح تیز۔ . . . سورج کی کرنیں میرے بدن کو چھید رہی ہیں مسام جیسے زخم بن گئے ہیں آگ سی ہو رہی ہے مساموں میں جیسے کسی نے زخم میں پسی ہوئی مرچ بھر دی ہے تند ہواؤں کی لپٹوں نے میرے بدن کو گرم راکھ میں دبے ہوئے کچے آم کی طرح جھلسا دیا ہے چلتے چلتے میرے پیروں میں آبلے آگئے ہیں . . . . مگر اب بھی میں چل رہا ہوں میری منزل کہاں ہے؟ میں کہاں جانا چاہ رہا ہوں میں نہیں جانتا . . . .

بغیر سوچے سمجھے میرا سفر جاری ہے . . . .

میں پیچھے پلٹ کر دیکھتا ہوں میرے پیچھے انسانوں کا اژدہام چلا آ رہا ہے سر جھکائے سر اٹھائے تمام تیز رفتار پالتو جانوروں کے ریوڑ کے پیچھے چرواہا درہ لئے جانوروں کو ہانک رہا ہو جیسے . . . . وہ کہاں لے جانا چاہتا ہے نامعلوم کہاں؟ وہ نظروں سے اوجھل ہے، کون ہے چرواہا؟

کہیں ایسا تو نہیں یہ انسانوں کا جم غفیر میرے نقش قدم پر چل رہا ہو، میں یہ جاننے کے لئے رک جاتا ہوں وہ سیلاب کی طوفانی لہروں کی طرح میری طرف بڑھتے ہیں اور میرے قریب سے اس طرح گذر جاتے ہیں جیسے میں راستہ میں پڑی کوئی بے جان، بے کار شے ہوں . . .

میں ابھی تک سر جھکائے چل رہا تھا میرے قدم رکے تو میں نے ننگی سڑک کو دونوں کناروں کو دیکھا . . . . اونچی اونچی ملک بوس ایرکنڈیشن عمارتیں کھڑی اونگھ رہی تھیں عمارتوں کی کچھ کھڑکیاں بند تھیں کچھ میں پردے جھول رہے تھے عمدہ رنگین پردے میرے لباس سے زیادہ قیمتی ـــ جی چاہا کہ ان پردوں کو نوچ ڈالوں اپنے لباس کے چیتھڑوں ایسا بنا دوں لیکن عمارتیں اونچی تھیں اور میرے ہاتھ وہاں تک نہیں پہونچ سکتے تھے میں اپنی بے بسی پر مٹھیاں بھینچ کر رہ جاتا ہوں

عمارتوں کی کچھ کھڑکیوں کے پردے سرکتے ہیں ان میں سے تر و تازہ چہرے جھانکتے ہیں ان چہروں پر تازگی دیکھ کر میرے سینے میں آگ بھڑک اٹھتی ہے وہ آگ تھوک کی شکل میں میرے منہ سے نکلتی ہے لیکن میرا تھوک ان تک نہیں پہونچ پاتا الٹا میرے جھلسے ہوئے چہرہ پر آ جاتا ہے کتنی بلندی پر ہیں وہ لوگ وہ تمام قہقہہ لگاتے ہیں میں سر جھکا کے اپنا چہرہ پونچھتا ہوں اسی اثناء میں بند کھڑکیاں بھی کھل جاتی ہیں تمام کھڑکیوں سے جھانکتے ہوئے خوبصورت (جو خوبصورت نہیں تھے) تر و تازہ چہرہ مجھ پر تھوکنے لگتے ہیں اور قہقہے بھی لگاتے جاتے ہیں

میرے قدم اس مقام سے آپ ہی آپ اٹھ جاتے ہیں . . . . اب میں سر جھکائے نہیں چل رہا ہوں سر اٹھائے اپنے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے . . . .

سامنے سڑک کے ایک کنارے پر نل کے سامنے پانی کے لئے ایک لمبی قطار کھڑی ہے ہاتھوں میں بالٹیاں، مٹکے لئے سوکھے، روکھے چہرے والے قطار بڑھتی جا رہی ہے بڑھتی جا رہی ہے . . . .

دوسرے کنارے پر ایک لحیم شحیم توند والا شخص اپنی کمر پر ہاتھ رکھے کھڑا دکان کے سامنے اپنے نحیف دبلے پتلے سوکھے لبوں اور روکھے چہرے والے نوکر سے پانی کا بیدردی سے چھڑکاؤ کروا رہا ہے اپنی دکان کے کونے کے نل سے، وہ نل اس کی اپنی ملکیت ہے اور وہ شہر کا دادا ہے اس لئے کسی کی کیا مجال جو نل سے ایک قطرہ بھی پانی بیجا کر

اور اس سے کچھ فاصلے پر ایک لاغر بوڑھا، ہڈیوں کا پنجرہ دو بوند پانی کے لئے ترس رہا ہے . . . .

ـــ مجھے یہ سب کچھ دیکھا نہ گیا۔ میں اس گوشت کے پہاڑ کے قریب گیا میرا حلیہ دیکھ کر اس نے ناک بھوئیں چڑھائیں کچھ پیچھے ہٹا، کیا ہے؟ گوشت کا پہاڑ غرایا۔

"تھوڑا پانی!"

"چھی چھی، تمہارے لئے نل ادھر ہے!" کراہیت سے وہ بولا۔

"میرے لئے نہیں، اس لاغر کے لئے۔"

اس کے لئے بھی وہ نل ہے، جا! اس نے مجھے جھڑکا، دھتکارا میرے کمزور بدن میں خون کی رفتار تیز ہو گئی کنپٹیاں پھڑکنے لگیں

میں اسی نل سے پانی لے جاؤں گا۔ اسی نیت سے میں آگے بڑھا اور اس کا دبلا پتلا غلام جو پانی کا چھڑکاؤ کر رہا تھا اس نے میرے بازو پکڑ لئے، بدزبان، نیچ میرے مالک سے اونچی آواز میں بات کرتا ہے میں نے اس کا چہرہ دیکھا ـــ میری طرح مرجھایا ہوا تھا میرا اپنا لگ رہا تھا وہ نیچ لیکن غلامی کی روٹی نے اس کے خون میں بیوفائی پیدا کر دی تھی

اس نے مجھے اس زور سے دھکا دیا کہ میں گر پڑا۔ میرے گرتے پر نل کے سامنے لگی ہوئی قطار بھی ہنسنے لگی۔ . . . .

وہ لاغر اپنے بدن کو گھسٹ گھسٹ کر بیچ سڑک میں لے آیا تھا اسی وقت ایک چمکیلی کار بجلی کی طرح آئی اور اسے کچلتے ہوئے آگے بڑھ گئی میری سانس سینے میں گھٹ گئی آنکھیں ہیبت سے پھٹ پڑیں دل کی دھڑکنیں بند ہو گئیں جیسے خون رگوں میں منجمد ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

سرخ سرخ خون ننگی گرم تپتی ہوئی سڑک پر پھیل چکا تھا لاغر بدن بجھتے دیئے کی لو کی طرح کانپ کر خاموش ہو گیا تھا صرف ایک چیخ فضا میں منتشر ہو کر معدوم ہو گئی تھی اور کچھ نہیں ہوا تھا۔ نہ کوئی رویا نہ چلایا نہ کسی نے افسوس کیا۔

نل کے سامنے لگی قطار میں ایک پھٹے حال "بوڑھے کمزور" شخص نے تھوڑی ہل چل کی لیکن پیچھے سے ایک تندرست "نوجوان" کی آواز نے اسے پھر کھمبے کی طرح گاڑ دیا "پھر یہ نمبر نہیں ملے گا بڈھے!" اور اس کے پیر زمین میں دھنس گئے تھے۔

یکلخت میری ذہن کی نسیں کھنچنے لگیں میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ تھام لیا پھٹی پھٹی وحشت زدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے

لگا.....

خوب صورت عمارتیں چکرا رہی تھیں فلک کے سامنے لگی لمبی قطاروں میں ہل چل مچی ہوئی تھی تمام ایک دوسرے میں گتھم گتھا ہو رہے تھے..... بالٹیاں مٹکے فضا میں گیس کے غباروں کی طرح اڑ رہے تھے..... سبھی سنوری دکانیں بکھر گئیں تھیں۔ گوشت والا وہ گوشت کا پہاڑ زمین بوس ہو گیا تھا..... سڑک پر سے اس لاغر کی کچلی ہوئی لاش تن کر کھڑی ہو گئی تھی اپنے بازو خوفناک انداز میں پھیلائے جیسے تمام انسانوں کو اپنے بازوؤں میں دبوچ کر ان کی پسلیاں توڑ ڈالے گا سڑک پر جما ہوا اس کا خون تیزی سے چاروں طرف پھیل رہا تھا اور اس سے بھیانک چہرے والے خونخوار انسان بن بن کر کھڑے ہو رہے تھے..... اپنے بازو پھیلائے شیروں کی طرح غرا رہے تھے۔.....

میرے دل میں مسرت کی ننھی سی کرن جگمگانے لگی..... ایسا ہی ہو..... ایسا ہی ہو!! سب کچھ فنا ہو جائے، فنا یہ غیر مساوی، ذلیل خبیث دنیا، یہ سنگدل ظالم، جھوٹے کمینے انسان سب کچھ۔

لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ سب کچھ جوں کا توں تھا صرف میرا ذہن چکرا گیا تھا میری کھوپڑی میں زلزلہ آ گیا تھا اور کچھ نہیں ہوا تھا۔

سورج اپنی جگہ سے ہلا تھا۔ نہ زمین کانپی تھی نہ آسمان کا رنگ پھیکا پڑا تھا جیسے اس دنیا کا کوئی رکھوالا نہیں تھا کوئی خدا نہیں.....

میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں سائیں..... سائیں.....

میرا دل انجانے کرب سے چیخ پڑا دل کی چیخ خود میرے کانوں میں گونج کر رہ گئی ان بے آواز چیخوں سے میرے کان کے پردے پھٹے جا رہے ہیں.....

احساسات دینے والے مجھے بے حس بنا دے، اندھا، بہرا، گونگا، لنگڑا نہیں پتھر بنا دے مجھے ایسا پتھر جو انسانوں کے کوئی کام نہ آ سکے۔ خودکشی میرے بس میں ہوتی تو میں کبھی کا مر گیا ہوتا۔ لیکن زندگی کا خاتمہ میرے بس میں نہیں اور زندگی گذارنا میرے لئے ایک مشکل امر ہے میں کہاں جاؤں کہاں، کدھر؟

بے تحاشہ میں دوڑنے لگا..... تپتی ہوئی ننگی ریت پر اپنی ناک کی سیدھ میں..

میرے دائیں بائیں بلند و بالا عمارتوں کا کبھی ختم نہ ہونے والا سلسلہ.....

آگے پیچھے انسانوں کا جم غفیر.....

چلتی پھرتی زندہ لاشیں.....

تلاش رزق میں سرگرداں حیران پریشاں اور.....

ہنستے قہقہے لگاتے لوگ بے فکر تر و تازہ ہٹے کٹے.....

کاروں بسوں کا شور.....

دھواں ـــ

گرد و دھوپ کی شدت

میں بھاگ رہا تھا..... بھاگے جا رہا تھا..... اور ایک سوال میری آنکھوں کے سامنے معلق تھا۔

کہاں؟ کدھر؟

اس کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا

سورج رفتہ رفتہ ڈھلنے لگا تھا۔ میری دوڑنے کی رفتار بھی سست ہو رہی تھی

سورج غروب ہو گیا۔ چاروں طرف سیاہی پھیل گئی حسب معمول شہر کے برقی قمقمے سلگ گئے رات کی سیاہی کو سپیدی میں بدلنے کے لئے آسمان پر اکا دکا ستارے بھی ٹمٹمانے لگے..... افق مشرق سے چاند اپنا زرد زرد چہرہ لئے ابھر آیا اور اداس اداس دھندلی چاندنی دور تک بکھرتی چلی گئی۔

میرے قدم رک گئے ـــ

میرے پیروں میں سوزش ہو رہی تھی پنڈلیاں مارے درد کے خون پیپ سے بھرا تمتماتا ہوا پھوڑا بن چکی تھیں..... سانس بری طرح پھول گئی تھی میں پورے بدن سے ہانپ رہا تھا منہ کھولے زبان باہر نکالے اس بوڑھے مریل وفادار کتے کی طرح مالک کو جس کی ضرورت نہیں رہی تھی اس نے اپنے گھر سے دور چھوڑ آیا تھا لیکن کتا رات ہونے سے قبل اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لئے پھر مالک کی چوکھٹ پر دوڑتے ہوئے آ گیا تھا اور دم ہلا ہلا کر ہانپنے لگا تھا

یکدم میں بری طرح چونک پڑا.....

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا میں نے ہتھیلیاں زور زور سے اپنی پلکوں پر رگڑیں..... دیکھا..... نہیں میں غلط نہیں دیکھ رہا تھا... سامنے میرا گھر تھا..... میرا اپنا گھر.....

میں دو قدم آگے بڑھا..... میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، میرے نام کی تختی دیکھ کر جو دروازے پر لگی ہوئی تھی۔ میرے نام کے آگے ڈگریوں کی قطار اور عہدے لکھے ہوئے تھے

"نہیں..... نہیں یہ سب جھوٹ ہے، دھوکہ فریب میں کچھ بھی نہیں خود کچھ بھی نہیں!! میری بے آواز چیخیں میرے کانوں میں ہی گونج کر رہ گئیں میں نے ہاتھ بڑھا کر اس تختی کو نکال کر پھینک دینا چاہا لیکن تختی دروازے میں نصب تھی بہت ہی مضبوط.....

ـــ میں نے دروازے کو دھکا دیا۔ لیکن دروازہ اندر سے بند تھا

میں نے زنجیر ہلائی..... دستک دی...

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور مجھے ایسا لگا جیسے میں قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑا ہوں..... "کون؟" بالکل میری جیسی آواز

"میں!"

"میں کون؟"

"میں" "میں" ہوں اس گھر کا مالک!

اس نے مجھے بغور دیکھا مالک! حقارت سے بولا "اوہ ہا!!" اور پھر زیر لب نامعلوم کیا کیا کہہ کر جھٹکے سے دروازہ بند کر لیا

میں دروازہ کی چوکھٹ پر کھڑا حیرت سے بند دروازہ کو تکنے لگا۔ میرا نام کی تختی میرا مذاق اڑا رہی تھی

بچوں کیلئے پورے صفحات کی رنگین
تصاویر سے مزین کہانیاں
مترجم ظ۔ انصاری۔ کم قیمت پر دستیاب ہیں

آمنہ عدم

اپنی ماں سے کہو واپس آجائے

زرین گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر ناصر کے انتظار میں برآمدے کی سیڑھیوں پر آبیٹھی، مکان کے اونچائی پر ہونے کی وجہ سے یہاں سے سڑک دور تک صاف دکھائی دیتی تھی اس نے سیڑھیوں کے ساتھ لگے ستون سے سر ٹکاتے ہوئے اطراف میں نظر دوڑائی بہار کا آغاز ہو چکا تھا کئی ماہ کی محنت کے بعد اب چھوٹے سے لان میں گھاس نے سبز قالین کا روپ دھار لیا تھا عشق پیچاں کی بیل نے بڑھ کر برآمدے کی چھت کو ڈھانپ لیا تھا۔ کیاریوں میں رنگ برنگے پھول کھل رہے تھے۔ زرین کا چہرہ بھی پھولوں کی طرح کھل اٹھا اطمینان اور مسرت کی ایک لہر اس کے سارے وجود میں دوڑ گئی۔

چھ ماہ پہلے جب وہ شادی کے بعد یہاں آئی تھی تو کیسا اجاڑ تھا یہ گھر، اس کی دن رات کی محنت نے چھ ماہ ہی میں اس گھر کو یکسر بدل کر رکھ دیا تھا زرین ایک بڑے شہر اور بھرے پرے گھر سے یہاں آئی تھی یہ گھر سب سے الگ تھلگ تھا۔ پاور ہاؤس کے افسران کی کالونی یہاں سے کافی دور تھی۔ اور مقامی آبادی کی بستی تو ندی پار اور بھی دور تھی لیکن ناصر کی محبت اور گھر کی مصروفیات نے اسے تنہائی کا احساس بھی نہیں ہونے دیا۔ اب پھولوں سے ڈھکا یہ چھوٹا سا گھر ہی زرین کو جنت نظر آتا تھا۔

وہ ان ہی سوچوں میں گم تھی کہ اسے دور سے ناصر آتا نظر آیا وہ استقبال کیلئے اٹھ کھڑی ہوئی آج کھانے پر اس نے ناصر کی من پسند ڈش روسٹ چکن تیار کیا تھا۔

بڑے خوشگوار ماحول میں وہ دونوں کھانا کھا رہے تھے کہ زرین کو کچھ خیال آیا وہ کھاتے کھاتے بولی۔

"ناصر آج صبح ایک عجیب بات ہوئی اسٹور سے کچھ سامان نکالنے کے لئے میں گھر کی پچھلی طرف گئی تو وہاں ایک عورت کھڑی تھی شکل صورت سے مقامی لگ رہی تھی وہ تھوڑی ہی دیر تک کھڑی مجھے گھورتی رہی اور پھر اپنی زبان میں کچھ بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔"

زرین نے محسوس کیا کہ اس کی اس بات سے ناصر کا موڈ خراب ہو گیا اور اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے ہیں وہ بولا!

"آئندہ خیال رکھنا میں چوکیدار کو بھی تاکید کر دوں گا مت گھسنے دیا کرو ایسی عورتوں کو نہ جانے کب کیا چوری کرنے آئی ہو۔"

"نہیں ناصر وہ چور نہیں لگ رہی تھی۔ چور ہوتی تو مجھے دیکھتے ہی بھاگ جاتی پتہ نہیں وہ کیا چاہتی تھی میں اس کی زبان جانتی تو شاید پوچھ بھی لیتی زرین نے کہا۔

اس گفتگو کے بعد ناصر نے کھانا بھی بس جیسے تیسے پورا کیا اور پھر کھانا کھا کر وہ سو گیا۔ سہ پہر کے بعد اٹھا تو اس کا موڈ خوشگوار تھا اس نے زرین سے کہا چلو کالونی کے کلب چل کر ٹیبل ٹینس کھیلتے ہیں زرین فوراً تیار ہو گئی اور وہ دونوں اس خوبصورت شام کا لطف لیتے ہوئے پیڑوں کے سائے سائے اس سڑک پر ہنستے بولتے چل دیئے ابھی وہ کچھ دور ہی گئے تھے کہ زرین کی نظر ایک درخت کے نیچے کھڑی عورت پر پڑی وہ زور سے چلائی "دیکھو ناصر یہ وہی عورت ہے جو آج گھر کے پیچھے کھڑی تھی" ناصر کی نظر اس عورت پر پڑی تو اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اس نے زرین کا بازو تھاما اور تیز تیز قدموں سے اس عورت کے پاس سے نکلتا چلا گیا اپنے بازو پر ناصر کی سخت گرفت سے زرین کو احساس ہو گیا کہ ناصر غصے میں ہے زرین نے پلٹ کر دیکھا اس عورت کی نظریں مسلسل ان کا تعاقب کر رہی تھی۔

اس کے بعد کا راستہ خاموشی سے کٹا کلب پہنچ کر ٹیبل ٹینس شروع کی لیکن آج ناصر کے کھیل میں وہ بات نہیں تھی اسکا ذہن الجھا ہوا تھا۔ زرین بہت اچھا کھیلتی تھی۔ کوشش کے باوجود بھی وہ کبھی ناصر سے نہیں جیت سکی تھی لیکن آج ناصر اس سے ہار گیا مگر زرین کو اپنی جیت پر ذرا بھی خوشی نہ ہوئی۔

رات تک ناصر پھر نارمل ہو چکا تھا کھانے پر زرین نے پوچھا "کیا بات ہے آپ آج جان بوجھ کر کیوں ہار گئے؟"

"ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں ایک تو آج میرے سر میں کچھ درد ہو گیا تھا اور دوسرے سچی بات یہ کہ تم کھیلی ہی بہت اچھا" ناصر نے جواب دیا۔

دن پھر خوش و خرم گزرنے لگے ناصر دن ہی شروع

اور ہنسنے ہنسانے والا ہوگیا۔ اس دوران زرین نے مقامی زبان سیکھنے کی کوشش شروع کردی اور تھوڑی تھوڑی سمجھنے بھی لگی۔ اس سے پہلے ملازم کو کوئی کام بتانے میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ ناصر کو یہاں کی بولی پر عبور حاصل تھا۔ اس لئے وہی ترجمان کا کام انجام دیتا تھا۔

آج زرین کالونی کی طرف گئی تو اسے آٹھ دس سال کی عمر کے دو بچے پھرتے ہوئے نظر آئے ان کا حلیہ

تو مقامی لوگوں جیسا تھا لیکن ان کی رنگت ان سے کچھ مختلف تھی اسے کچھ تعجب ہوا۔ واپسی میں اس نے ناصر سے اس بات کا ذکر کیا تو اس نے بتایا "بعض باہر سے آنے والے لوگ یہاں کی لڑکیوں سے شادیاں کر لیتے ہیں اور واپسی پر یہ شادیاں ختم کر جاتے ہیں۔

"اور یہ بچے" زرین نے حیرت سے پوچھا۔ "بچے رہتے ہیں۔ انہیں کچھ پیسے خرچے کے لئے جب ذرا سمجھ دار ہو جاتے ہیں تو فوراً ہی فیکٹریوں میں تعلیم کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ اس ساری صورت حال کا لڑکی کو پہلے سے علم ہوتا ہے دراصل یہاں غربت بہت ہے اس لیئے والدین اور لڑکی ہر ماہ ایک معقول رقم کے بدلے، آسانی سے تیار ہو جاتے ہیں۔

زرین کو یہ جان کر بڑا دکھ ہوا۔

ایک دن زرین کمرے میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی کہ اسے کچھ لوگوں کے بولنے کی آوازیں سنائی دیں اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو وہی عورت لکڑی کے گیٹ کے پاس نظر آئی اس کی گود میں ایک چھوٹی بچی تھی اور وہ چوکیدار سے کچھ کہہ رہی تھی جس کے جواب میں چوکیدار بھی زور زور سے کچھ بول رہا تھا دفعتاً عورت نے گیٹ میں گھسنا چاہا مگر چوکیدار نے اسے دھکا دے دیا اور وہ عورت بچی سمیت نیچے جا گری۔ زرین یہ دیکھ کر غصہ میں باہر نکلی اور اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں چوکیدار کو ڈانٹنے لگی پھر اس نے اپنے پرس سے چند نوٹ نکال کر عورت کی طرف بڑھائے مگر عورت نے انہیں لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا وہ پہلے تو نفرت سے زرین کو گھورتی رہی پھر اس نے نوٹ جھپٹ کر زمین پر پھینکے اور ان پر سر رکھتی ہوئی چلی گئی۔

جب ناصر گھر آیا تو زرین نے سارا واقعہ اس سے بیان کیا اور کہا "چوکیدار نے بدتمیزی کی حد کردی اس

زور سے دھکا دیا کہ بیچاری ننھی سی بچی سمیت نیچے گر گئی"۔

اب اتنی بھی ننھی نہیں ہے تین سال سے زیادہ ہی کی ہوگی" ناصر بولا۔

تمہیں کیسے معلوم"؟ زرین نے کچھ حیرت زدہ ہوتے ہوئے سوال کیا۔ تب ناصر نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولا آج تمہیں ساری بات بتانی ہی پڑے گی میں زیادہ عرصے ضمیر کا یہ بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔

زرین! تم پہلے یہاں آرام سے بیٹھ جاؤ اور پلیز درمیان میں کوئی سوال نہ کرنا"

زرین بڑی بے چینی کے عالم میں بیٹھ گئی۔ ناصر نے کہنا شروع کیا۔

یہ سروس جہاں میں اب ہوں پہلے یہاں میرے ابو تھے امی کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا اس لیئے میں ہاسٹل میں رہ کر تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ چھٹیوں میں ابو کے پاس آجاتا میرے انٹر کے امتحان ہونے ہی تھے کہ اچانک ابو کا انتقال ہو گیا۔ اب تعلیمی اخراجات کا کوئی ذریعہ نہ تھا ایسے میں ابو کے دوست کام آئے انہوں نے

کوشش کر کے مجھے یہاں ملازمت دلوا دی اور مشورہ دیا کہ میں پرائیوٹ طور پر پڑھائی بھی جاری رکھوں۔

اور پھر میں یہاں مستقل چلا آیا اس وقت میری عمر سترہ اٹھارہ سال ہوگی۔ یہ جگہ تم دیکھ ہی رہی ہو کتنی سنسان ہے آج سے دس گیارہ سال پہلے اور بھی سنسان تھی۔ شام کے پانچ بجتے ہی سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں چلے جاتے پھر میں ہوتا اور کتابیں، لیکن کتابیں پڑھتے پڑھتے میں عاجز آگیا۔ تنہائی مجھے کاٹنے کو دوڑتی سناٹا مجھے ڈسنے لگا میرا جی چاہتا کوئی مجھ سے باتیں کرے کوئی میری باتیں سنے اور میں کسی کو اپنی سناؤں یہاں کے ملازموں کو مختلف چیزوں کا لالچ دے کر روکنے کی کوشش کرتا لیکن سب بیوی بچوں والے تھے شام ہوتے ہی گھر بھاگنے کی کوشش کرتے میری ڈیوٹی ایسی تھی کہ کسی بھی وقت میری ضرورت پڑ سکتی تھی اسی لیئے مجھے پاور ہاؤس سے پاس گھر دیا گیا تھا۔

"ایک دن جب میں نے ایک ملازم کو روکنا چاہا تو اس نے کہا "جناب ہم لوگ روز روز ادھر کیسے رک سکتا ہے ہم بیوی بچہ والا لوگ ہے کبھی بچہ بیمار کبھی کوئی اور پریشانی گھر بار تو دیکھنا پڑتا ہے نا۔ ہماری مانو تو ادھر گاؤں سے کوئی لڑکی لے آؤ ہم کو معلوم ہے۔ تم اکیلے بہت گھبراتا ہے۔ لڑکی تمہارا کام کرے گا۔ تمہاری تنہائی بھی دور ہو جائے گا"۔

میں گھبرایا اور کہا "یہ کیا کہہ رہا ہے"

وہ بولا "ٹھیک بولتا ہے صاحب! بستی میں بڑا غریب لوگ ہے تھوڑا پیسہ ہر مہینہ دو تو تیار ہو جائے گا تمہارا مرضی ہے جب تک دل میں آئے رکھنا پھر وہ

واپس چلا جائے گا"۔

"اور دوسرے دن جب وہ آیا تو اس کے ساتھ ایک مرد ایک عورت اور ایک تیرہ چودہ برس کی لڑکی تھی وہ بڑے اشتیاق سے گھر کی ہر چیز دیکھ رہی تھی مجھے دیکھا تو معنی سفید دانت نکال کر ہنس دی عمر کے

اس دور میں ہر لڑکی پر ایک خاص روپ آجاتا ہے مجھے بھی کالی کالی رنگت کے باوجود یہ لڑکی بھلی معلوم ہوئی۔

دو سو روپے ماہوار پر اس کے ماں باپ اسے یہاں چھوڑ گئے بستی یہاں بہت خوش تھی اب میری تنہائی بھی دور ہو گئی تھی۔ لیکن سال بھر بعد جب پہلے لڑکے کی آمد کے آثار شروع ہوئے تو میں بہت گھبرایا لیکن اس کی پیدائش کے بعد رفتہ رفتہ ندامت کا یہ احساس بھی گزر گیا اس کے دو سال بعد دوسرا لڑکا ہوا تو مجھے کوئی غیر معمولی بات نہ لگی ان دونوں بچوں کو تم سڑک پر دیکھ چکی ہو۔ پھر یہ لڑکی پیدا ہوئی جسے تم نے عورت کی گود میں دیکھا تھا۔

"میں نے ذہنی طور پر کبھی اسے بیوی تسلیم نہیں کیا تھا نہ ہی وہ میرے اسٹینڈرڈ کی تھی۔ میں.. اسے کہیں ساتھ لیجا سکتا تھا نہ سوسائٹی میں تعلقات بڑھا سکتا تھا وہ تو بس میری وقتی تنہائی کی وجہ سے گھر آگئی تھی۔

پچھلے سال جب میں شہر جانے لگا تو اسے کہہ گیا تھا کہ شادی کر کے آؤں گا اسی لیئے جانے سے پہلے بستی کو اس کے گھر واپس بھیجوا گیا تھا۔

وہ جانے پر تیار تو نہیں تھی لیکن ڈرانے اور اس دھمکی پر اس کے گھر والوں کو ملنے والی رقم بھی بند ہو جائے گی وہ چلی گئی۔ مگر اس کے اخراجات کے لیئے میں بعد میں بھی کچھ رقم بھجواتا رہا۔

شہر پہنچا تو تم سے ملاقات ہوئی پہلی ہی ملاقات میں تم بہت اچھی لگیں دل تمہاری طرف کھنچتا ہی چلا گیا۔ مجھے پہلی بار پتا چلا کہ محبت کیا ہوتی ہے تم مجھے اپنے وجود کا حصہ لگنے لگیں۔ چاہنے کے باوجود میں تمہیں اپنا ماضی نہ بتا سکا مجھے ڈر تھا کہیں تمہیں کھو نہ دوں اور پھر ہماری شادی ہو گئی مجھے لگا جیسے میری ذات کی تکمیل ہو گئی ہے۔ اس کے بعد کے سب حالات سے تم واقف ہو میں زیادہ دن اس بات کو تم سے راز نہیں رکھ سکتا تھا اس لئے آج سب کچھ کہہ دیا۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے"۔

زرین یہ ساری روداد سنتے سنتے ٹھنڈی پڑ چکی تھی اسے لگ رہا تھا کسی نے اسے آسمانوں سے

اٹھا کر پھینک دیا ہے وہ گہرائیوں کی سمت گرتی چلی جا رہی ہے خوف سے اس کی آواز بند ہو چکی تھی اور اس کا گلہ سوکھ رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر سکتے کے عالم میں یونہی بیٹھی رہی پھر اس کی مدھم آواز سنائی دی

"مجھے کچھ عرصہ چاہیے آج سے تین ماہ بعد میں اپنا فیصلہ سنا سکوں گی اور آج سے میں الگ کمرے میں رہوں گی۔"

اور اسی دن زرین اپنی ضروریات کی چیزیں لے کر دوسرے کمرے میں منتقل ہو گئی دن بھر وہ پہلے ہی کی طرح گھر کے کاموں میں مصروف رہتی۔ ناصر کے کپڑے دھونے استری کرنے اس کے جوتے پالش کرنے ہر قسم کا کام وہ پہلے ہی کی طرح کرتی رہی وہ کھانا بھی ساتھ ہی کھاتے آپس میں ضروری بات چیت بھی ہوتی۔ گھر آنے والے کسی شخص کو محسوس بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک دوسرے سے کتنے دور ہیں۔ دن گزرتے رہے اور آخر تین ماہ کا عرصہ پورا ہونے کو آیا ناصر خوش تھا اس کا خیال تھا کہ زرین اسے معاف کرنے پر تیار ہو گئی ہے۔ آج اس مدت کا آخری دن تھا ناصر سو کر اٹھا تو اسے ایک لفافہ ملا اس نے جلدی جلدی کھولا۔ زرین نے لکھا تھا۔

"ناصر ان تین ماہ میں میں نے اپنے آپ کو اچھی طرح پرکھا لیکن میں ان ساری باتوں کو نہ بھلا سکی جو تم نے مجھے سنائیں۔ مجھے اس تصور ہی سے کہ وہ میلی کچیلی بچی تمہاری گود میں چڑھی رہتی ہوگی متلی سی ہونے لگتی ہے جب خیال آتا ہے کہ تمہاری ان باہوں میں دس سال وہ کالی عورت سمائی ہوگی تو اپنے گرد ان باہوں کے تصور سے مجھے اپنے وجود سے بھی گھن آنے لگتی ہے وہ بستر جس پر تم کسی اور کے ساتھ سوتے رہے مجھے کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ میں ایک مسلسل روحانی کرب میں مبتلا ہوں میرا خیال ہے مجھے شہر چلا جانا چاہیے شاید وہاں جا کر میں صحیح فیصلہ کر سکوں"

"کاش تم شادی سے پہلے مجھے سب کچھ بتا دیتے یوں لاعلمی میں لٹنے کا غم تو نہ ہوتا۔ ہو سکتا ہے اس وقت سب کچھ جان کر بھی میں تمہیں اپنا لیتی میری نظروں میں تمہاری سچائی تمہارا مقام اور بلند کر دیتی۔ یہ گھر جہاں بستی دس سال سے مالکن بنی ہوئی تھی میں نے اس سے چھین لیا۔ اس کی نظروں میں چھپی نفرت اور حقارت اب میری سمجھ میں آئی ہے —— پلیز تم میرے جانے کا انتظام کر دو۔"

زرین

خط پڑھ کر ناصر نے زرین سے پوچھا۔

"کب جانا ہے۔"

"ہو سکے تو آج ہی۔" زرین نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں کسی آدمی کو بھیج کر جہاز کے ٹکٹ منگا لیتا ہوں، دوپہر کی لانچ سے تم ندی پار کر لینا وہ آدمی وہاں سے تمہارے ساتھ جا کر تمہیں سوار کرا دے گا۔" ناصر نے اداس مگر ٹھہرے ہوئے لہجے میں زرین کو بتایا۔

دوپہر کو زرین ایک سوٹ کیس میں ضروری چیزیں اور ایک بیگ لے کر گھر سے نکلی تو اس نے پلٹ کر ایک الوداعی نظر پھولوں سے لدے اس گھر پر ڈالی جسے سنوار کر اس نے ایک نیا روپ دیا تھا۔ چند ماہ پہلے تک اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ کبھی یوں وہ اس جنت کو چھوڑ کر چل دے گی اس نے ایک طویل سانس لیا۔ پھولوں سے لدی شاخیں ہوا سے یوں لہرائیں جیسے زرین کو خدا حافظ کہہ رہی ہوں۔ لانچ کی روانگی کے وقت ناصر نے ہاتھ ہلایا تو اسے لگ رہا تھا اب وہ کبھی واپس نہ آئے گی۔

ناصر تھکا تھکا گھر واپس آیا اور جوتوں سمیت ہی بستر پر دراز ہو گیا اپنی سوچوں میں وہ اس قدر گم تھا کہ اسے احساس ہی نہ ہوا کہ کب شام ہوئی اور کب اندھیرا پھیل گیا وہ تو اس وقت چونکا جب کچھ کھڑکا سا ہوا اور کھڑکی پر اسے سائے سے نظر آئے اس نے چلا کر پوچھا "کون ہے" دو بچے ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوئے۔

"اماں کہتی ہے کچھ چاہیے تو نہیں" بڑے بچے نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں مجھے کچھ نہیں چاہیے چلے جاؤ یہاں سے" بچے پلٹ کر چل پڑے۔

"ٹھہرو" ناصر نے انہیں آواز دے کر روکا۔

"اپنی ماں سے کہو وہ واپس آ جائے۔" دو گرم آنسو اس کے گالوں پر پھیل گئے۔

"کب" بچوں نے بے چینی سے پوچھا۔

"آج ہی" یہ ناصر ہی کی آواز تھی اور بچے خوشی سے بھاگتے چلے گئے۔

افسانہ

بخار

مُمتاز قیصر شیم

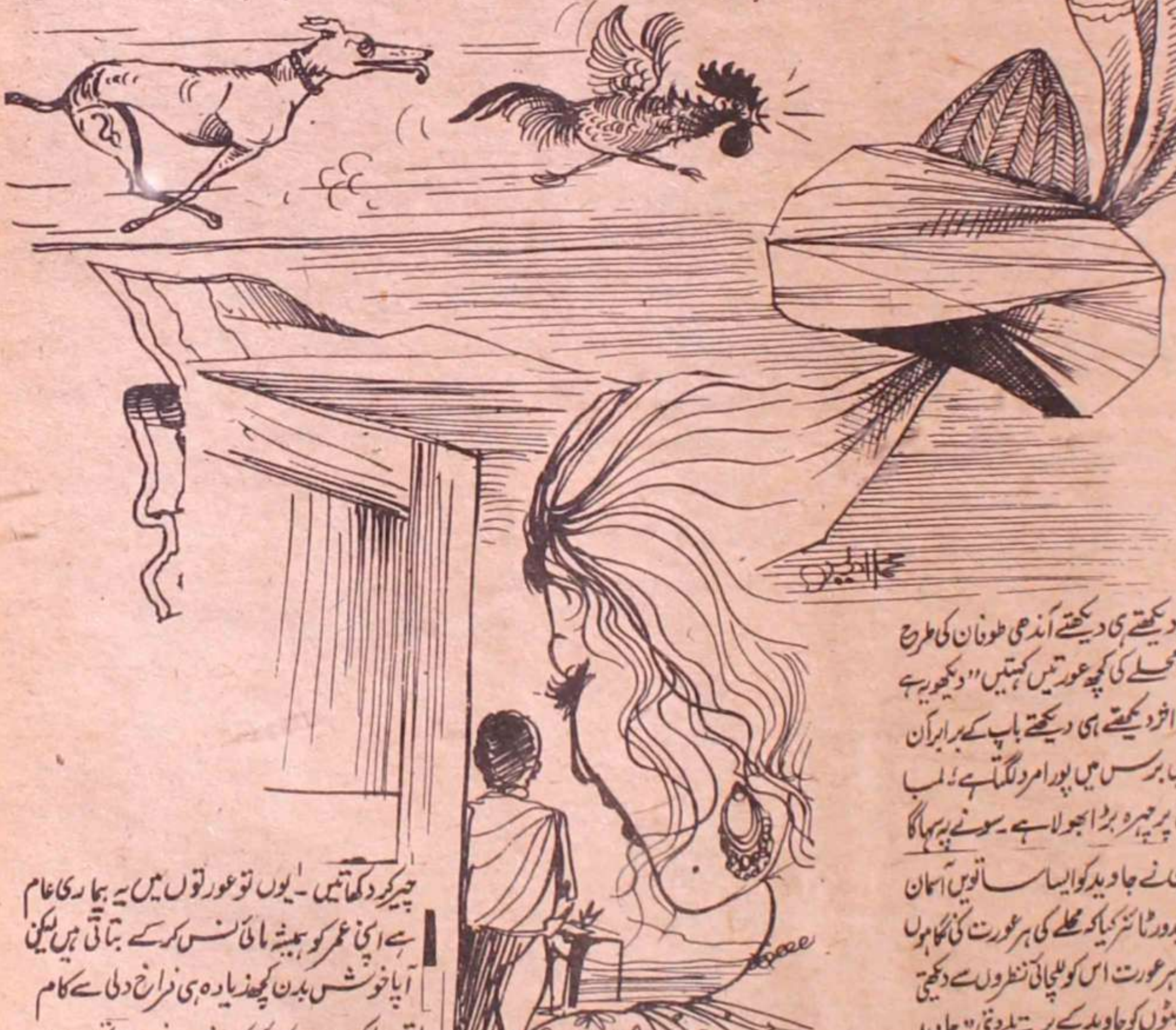

جاوید دیکھتے ہی دیکھتے آندھی طوفان کی طرح بڑھ گیا اس پر محلے کی کچھ عورتیں کہتیں "دیکھو یہ ہے کھلائی پلائی کا اثر دیکھتے ہی دیکھتے باپ کے برابر کن لگا" "تیرھویں برس میں پورا مرد لگتا ہے"، لمب تڑنگا تو ہے ہی پر چہرہ بڑا اجلا ہے۔ سونے پہ سہاگا آپا خوش بدن نے جاوید کو ایسا ساتویں آسمان پر بٹھایا۔ ایسا ایڈورٹائز کیا کہ محلے کی ہر عورت کی نگاہوں کا مرکز بن گیا۔ ہر عورت اس کو للچائی نظروں سے دیکھتی اور اپنے اپنے بیٹوں کو جاوید کے پر تلے دیتی" جاوید کو دیکھو ہمیشہ کلاس میں فرسٹ آتا ہے، کسی لونڈے لپاڑے کے منہ نہیں لگتا ہے، بس وہ وہ ہے اور کتاب ہے۔ زیادہ ہوا تو خوش بدن کے گھر چلا گیا۔ ایک تم ہو آسمان سے اونچی چھلانگیں لگاتے ہو اور رات کو مسافر خانہ میں آرام فرمانے چلے آتے ہو وغیرہ وغیرہ۔

لیکن مجھے تو جاوید میں ایسا کچھ نظر نہ آتا جتنا کہ آپا خوش بدن نے ہندوستانی فلم کے ہیرو کی طرح کل خوبیوں کا مجسمہ بنا کر پیش کر دیا اور یہ تصویر ہر عورت کے ذہن نشین کرا دی، ہاں اتنا ضرور تھا کہ ذہین، سنجیدہ سا بچہ تھا۔ اور نہ جانے مجھے تو ہمیشہ اسے دیکھ کر یہ احساس ہوتا کہ کسی گہرے کرب سے گذر رہا ہے۔ ابھی رویا تو ابھی رویا مجھے تو اس کے لڑکیوں کی طرح شرمانے پر الٹی کوفت سی ہوتی تھی۔ اچھا بھلا لڑکا مذاق بن گیا۔ منچلی عورتیں اس کی حرکت سے لطف اندوز ہوتیں۔ جان بوجھ کر اسے راستے میں روک کر ماں کی خیریت پوچھا کرتیں۔ حد تو یہ ہے کہ اس کے ساتھ پڑھنے والی لڑکیاں اس سے مزے لیا کرتیں۔ وہ کسی کو منہ نہ لگاتا آخر آپا خوش بدن نے کونسا ایسا جادو کر دیا ہے جوان کے گھر دن رات پڑا رہتا تھا۔

ایک بات تھی جاوید ہی نہیں آپا خوش بدن کے گھر تو محلے بھر کے لونڈے لپاڑے بھرے رہتے ہیں۔ سنتے ہیں وہ بچوں کے مزاج کو بہت پہچانتی ہیں اور ان کے دل رکھنے کے لئے اپنی جان تک حاضر کر دیتیں میاں بچارے پیسہ کمانے کے لئے دن رات جان داؤں پر لگائے رہتے اور بیوی خوب فراخ دلی سے محلے کے بچوں کا دل رکھتی تھیں۔ آپا خوش بدن کی شادی بچپن ہی میں کسی ادھیڑ عمر مرد کر دی گئی تھی اس زخم کو اپنے گھر آنے والے ہر بچہ کو چیر چیر کر دکھاتیں۔ یوں تو عورتوں میں یہ بیماری عام ہے اپنی عمر کو ہمیشہ مائی نس کر کے بتاتی ہیں لیکن آپا خوش بدن کچھ زیادہ ہی فراخ دلی سے کام لیتیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں وہ خود جوان تھیں اور میاں خاصے بوڑھے لیکن ان کی تشفی جوان رہنے سے نہ ہوتی وہ اپنے کو ہمیشہ بچوں میں شمار کرتیں اور ہر سال اپنی عمر کو دھکے دے دے کر چودہ برس سے آگے نہ بڑھنے دیتیں نہ جانے ان پر یہ خبط کیوں کر سوار ہو گیا۔ ہمیشہ اپنے کو بچہ ثابت کرنے کی نت نئی تجویزیں پیش کرتی رہتیں۔

نصف دوم

ادھیڑ عمر اور بوڑھیوں کو ہمیشہ یہ کہہ کر ریجیکٹ کر دیتیں "ائے بھلا بتاؤ ان کا میرا کیا جوڑ؟" انھیں کھیل بھی بہت خوب پسند تھے۔ مثلاً ڈکم دبکائی یا پھر اندھا بھینسا بننا بہت اچھا لگتا تھا۔

ایک دن ممّی اپنے چکنے سفید جسم کو دیکھ کر ہنس رہی تھیں کہ اچانک جاوید جا پہنچے "ائے ہے خدارا جاوید آپ سے کتنی بار کہا ہے کہ گھر میں آنے سے پہلے کھانس کھنکار لیا کرو۔ اب آپ بچے نہیں ہیں خاصے بڑے ہو چکے ہیں۔ میواتیوں میں دیکھو تمہاری عمر کے لڑکوں کی شادی بھی ہو جاتی ہے اور بچے بھی ....

مجھے ہی کیا سمجھئے، ہو میری نو برس کی شادی ہوئی اور پانچ برس شادی کو ہو گئے۔ اللہ کی دین ہے کہ پانچ برس میں چار بچے بھی ہو گئے، اللہ جانے یہ کیسے ہو گئے۔ میرا تو اپنے میاں سے ایک دن دل نہ ملا۔" اس کا مطلب ہے آپ مجھ سے صرف ایک سال ہی بڑی ہیں۔" اور نہیں تو کیا میواتیوں میں دیکھو دلہن عمر میں پانچ برس بھی بڑی ہو تو وہ جانیں ملتے۔ اب آؤ بیٹھو نا کھڑے کیوں رہ گئے۔ آج کچھ اداس نظر آتے ہو میری بات بری لگ گئی؟ تمہیں میری جان کی قسم برا مت مانیو۔ تمہیں اپنا سمجھ کر (کے ہی) تو کہا ہے۔ اپنا گھر ہی تو ہے کسی وقت ننگے بیٹھے ہیں کھلے بیٹھے ہیں اور پھر میری تو عادت ہے نہا کے چادر لپیٹ کے ایسی ہی اٹھ آتی ہوں اور پھر آج کل گرمیاں ہیں نا بڑی گرمی لگتی ہے۔ بہت سے بچوں میں تجسس ہوتا ہے وہ عورتوں کو چوری چھپے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تم قسم کھاؤ تم تو ایسے نہیں ہو" ارے ارے آنٹی تم بھی آپ بھی کیسی بات کرتی ہیں کیا مجھ سے آپ کو ایسی امید ہے۔ میں تو آپ کے گھر اس لیے چلا آتا ہوں کہ آپ مجھے اچھی ہیں مجھے بھاتی ہیں میں اپنے کو بہت اکیلا محسوس کرتا ہوں۔ لگتا ہے میرا کوئی نہیں اس دنیا میں اسی احساس سے میں راتوں کو بہت روتا ہوں مجھے کوئی پیار نہیں کرتا۔ امی بھی مجھے اپنے سینے سے لگا کر پیار نہیں کرتیں اسی لیے مجھے انگلش فلمیں بہت پسند آتی ہیں۔ اس میں ماں اپنے بچے کو بہت پیار کرتی ہے ماتھے پر بوسہ لیتی ہے مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ آپ میرے بارے میں ایسی رائے رکھتی ہیں تو میں ہرگز نہیں آؤں گا۔ میں تو آپ کو اپنی ماں سمجھتا ہوں اور آپ بھی تو مجھے ایسا ہی پیار دیتی ہیں نا۔ اچھا خدا حافظ"

"ارے ارے تم تو برا مان گئے۔ میں تو یوں ہی کہہ رہی تھی۔ میں تمہیں ایسے ہرگز نہیں جانے دوں گی۔ آؤ چلو اندر کمرے میں چلو۔ بیٹھو۔ قسم کھاؤ میری جان کی تم نے برا تو نہیں مانا؟ نہیں برا کیوں مانوں گا پہلی بات تو آپ نے ٹھیک کہی مجھے کھانس کر آنا چاہئے لیکن دوسری بات قطعی غلط مجھے بھی دوسرے لڑکوں کی طرح سمجھ لیا۔" ارے نہیں میں تو مذاق کر رہی تھی۔ اچھا یہ بتاؤ آج تم اداس کیوں ہو؟ کچھ نہیں۔ آپ نے تو موڈ ہی خراب کر دیا۔" "دیکھو تم پھر ناراض ہو گئے۔ پہلے بات بتاؤ کیوں منہ لٹکائے ہو"۔ "بات کیا ہوتی۔ امی جان سے ہی الٹ پلٹ ہو گئی۔ مجھے لگتا ہے وہ مجھے پسند نہیں کرتی ہیں اس لئے میری ہر حرکت انھیں ناپسند ہے۔ میں سونا چاہتا تھا وہ اپنی سہیلیوں سے اس کمرے میں ممّی باتیں کر رہی تھیں۔ سب کے سامنے ذلیل کرنے لگیں اٹھ کے یہاں چلا آیا۔

ائے ہے ایسی حقیر باتیں اتنا ذلیل کیا اپنے بچے کا مزاج تک نہ پہچانتیں۔ توبہ ہے ایسی ماؤں کو بھی۔ ائے ہے مجھے کیا معلوم تھا اوپر سے میں نے بھی کھری کھوٹی سنا دیں۔ کھانا کھا لیا؟ ہاں۔ میرے گھر آنے کو تو تمہاری امی ضرور منع کرتی ہوں گی۔" "آپ کو بھی عجیب عجیب وہم ہوتے رہتے ہیں۔ وہ کاہے منع کریں گی؟ نہیں ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔ اچھا خیر چھوڑو اچھی اچھی باتیں کریں گے۔ تم نے وہ فلم دیکھی ہے "سہاگ رات"، سنا ہے بڑی اچھی ہے۔ اگر نہیں دیکھی ہو تو میرے ساتھ چلنا۔ فریدہ کے ابّا تو گئے ہیں باہر پندرہ دن کے لئے۔ بڑا دل گھبراتا ہے گھر میں پڑے پڑے۔" "آپ اپنے پیسے سے دکھائیں گی نا؟" "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ لو تم لیٹو میں اسی خوشی میں چائے بنا کے لاتی ہوں۔ اچھا جاوید ایک بات بتاؤ تم میرے گھر کیوں آتے ہو"؟ "ارے یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ آپ اچھی لگتی ہیں اس لئے۔" "سچ! سچ! میں اچھی لگتی ہوں۔ ہاں سچ بات تو یہ ہے کہ آپ اچھی اچھی باتیں کرتی ہیں اور من پسند چیزیں کھلاتی ہیں۔" "اچھا تو آنٹی اب چلتے" "کہاں؟ ابھی تو لڑ جھگڑ کے آئے ہو پھر چلے دل جلانے۔ لیٹ جاؤ یہیں۔ میرا بھی دل گھبرا رہا ہے گرمیوں کی دوپہر بھی اتنی بڑی ہوتی ہے کہ کاٹے نہیں کٹتی۔ لو میں ادھر اس کمرے میں جا کے سو جاتی ہوں" "نہیں آپ بیٹھئے۔ میں دوپہر میں کوئی سوتا ہوں بس کمرہ بند کر کے لیٹا رہتا ہوں اور نہ جانے کیا کیا سوچتا رہتا ہوں۔" "کیا ہوا تمہارے سر میں درد ہو رہا ہے؟" "نہیں یونہی ہاتھ رکھا تھا" "لاؤ میں دبا دوں۔" "نہیں آنٹی نہیں میرے درد نہیں ہو رہا ہے۔ جھوٹ مت بولو" "میں سچ کہتا ہوں درد نہیں ہے۔ آپ باتیں کیجئے نا۔" "نہیں لاؤ دبا دوں۔ بیٹھی ہی تو ہوں۔ بات بھی کرتی رہوں گی۔ آرام سے لیٹ جاؤ نا جوتا اتار کے ابھی تو پوری دوپہر پڑی ہے۔ لاؤ جوتا میں اتار دوں .....

ارے .... ارے آپ یہ کیا کر رہی ہیں ..... میں خود اتار لوں گا" "لاؤ ادھر رکھو سر" "چھوڑ دیجئے آنٹی میرے درد نہیں ہے" "اچھا تو لاؤ ایسے ہی دبا دوں"

"جاوید! جاوید! سو گئے .... اوئی میں بھی یہیں پڑی جاتی ہوں۔ ائے ہے کیا ہو گیا کیسے ہو گیا؟ میں آپ کا سر دباتے دباتے لڑھک گئی۔ کیا بتاؤں سوتا مرا برابر ہوتا ہی ہے ایسا لگا کہ فریدہ کے ابّو سو رہے ہیں۔ جو کچھ ہوا نیند کی حالت میں ہوا ہے۔ ایسا لگا .... میں کیا بتاؤں۔ لیٹ جاؤ تم لیٹ جاؤ نا۔ میں ابھی دودھ لاتی ہوں۔ ارے تمہارا تو ماتھا جل رہا ہے۔" "عجیب سا چکر آ رہا ہے۔ لیٹ جاؤ لیٹ جاؤ" "نہیں اب میں گھر جا رہا ہوں۔" "تمہاری مرضی"

"امی ___ امی جاوید کو پکڑو یہ کیا ہو گیا ___ جاوید! .... جاوید! کیا ہوا؟ .... تم کہاں تھے؟ ___ امی کچھ نہیں بس چکر آ رہا ہے لو لٹاؤ پلنگ پر۔ ارے بخار سے جسم جل رہا ہے ارے کیا ہوا تمہیں۔ بیٹے اب کچھ نہیں ڈانٹا اگر بتا تو کیا کر لیا۔ ابھی تو گئے تھے۔ کہاں گئے تھے؟ امی لُو لگ گئی ہو گی۔ ڈاکٹر کو جلدی بلائیے" "ہاں جا ذرا سا رفیع صاحب کو بلا لا۔

چنگاری برائے نام قیمت میں
سب سے زیادہ مواد پیش کرتا ہے

تین ننھے افسانے

سکون

دنیا اسے پاگل خانہ سا لگنے لگا تھا۔ اس کے پاس دولت، عزت سب کچھ تھا لیکن سکون کا نام ونشان تک نہ تھا ——— اور ایک دن وہ سکون کی تلاش میں اپنے سارے سکھوں کو تیاگ کر گھر سے نکل پڑا۔ جنگلوں کی خاک چھانی صحراؤں میں بھٹکا لیکن سکون کہیں نہ ملا مدتوں بعد جب وہ پھر گھر واپس لوٹا تو اس کے کپڑے پھٹ چکے تھے۔ بالوں پر گرد جم گئی تھی اور چہرے پر داڑھی اُگ آئی تھی۔ اسے لوگوں نے حیرت سے دیکھا اور پاگل سمجھ کر پاگل خانے میں ڈال دیا ——— اور اب وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ تھا کہ یہاں چاروں طرف سکون ہی سکون تھا۔

گھنٹی

بلیاں دہشت زدہ تھیں اور خوف سے ادھر اُدھر چھپی پھر رہی تھیں ——— اور ان سبھوں کی آنکھوں میں بس ایک ہی سوال تیر رہا تھا......

"چوہوں کے گلے میں گھنٹی کون باندھے ——— ؟"

ایک اور موت

جھونپڑیوں کی بستی سے آج پھر ایک ارتھی اٹھی۔ برگد کے نیچے دھیان میں مگن بابا کے چہرے پر نہ جانے کیوں سایہ لہرانے لگا تبھی کسی نے آکر کہا "بابا! رامو آج مرگیا......"

بابا نے ایک نظر اٹھا کر آنے والے کو دیکھا پھر دھیرے سے پھسپھسا پڑے "وہ زندہ ہی کب تھا......؟" اور پھر دھیان میں مگن ہوگئے۔

افسانے

فضل امام ملک

مقالہ

نسوانی لبریشن، اگلا قدم

دیویندر اسّر

آج سے کچھ برس پہلے کیا کوئی تصور کر سکتا تھا کہ مرد کے سائے تک سے بچ نکلنے والی عورتیں "اب یا کبھی نہیں" کا خطرہ درپیش آنے پر شادی، اولاد اور خاندان کی "انسانی جذباتی ضرورت" کو تسلیم کرنے لگیں گی۔ اور اس بات پر زور دینے لگیں گی کہ ہمیں خاندانوں کی بنیادوں کو مضبوط کرنا ہوگا، ہر عورت کی تکمیل امومیت میں ہے اور سچی اور مستقل خوشی مرد اور عورت کے گہرے ذاتی رشتوں میں ہے۔ "نسوانی لبریشن" کی تحریک میں یہ مراجعت کی لہر کہاں سے اور کیسے اُمڈ آئی؟ کیا کوئی حادثہ ہو گیا؟ شائد! جس خود کفیلی، شخصیت کی نمو ذات کی انفرادیت اور مرد سے نجات حاصل کرنے کے لئے زوردار مظاہرے کئے گئے۔ اخباروں اور رسالوں کے دفتروں پر دھاوا بولا گیا، انگیا چولی جلائی گئی اور اپنا ساتھ نہ دینے والوں کو "میل شورنسٹ پگ" کہہ کر دھتکارا گیا اُس کا انجام سامنے آنے پر انھوں نے اعلان کر دیا کہ مرد اور عورت کی نئی تمنا، کیریر، زندگی، "پیار اور شفقت" خاندان اور اپنی جڑوں اور ہمہ گیر انسانی رشتوں میں معنویت کی تلاش ہے۔

یہ عورت کے لبریشن کا نیا دور ہے۔

اس نئے دور کی روداد جیشی فرِیڈن نے حال ہی میں شائع اپنی نئی کتاب

میں بیان کی ہے۔ یاد رہے کہ مس فریڈن نسوانی لبریشن کے اولین مجاہدین میں سے ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں شائع جن کی کتاب

کو اس تحریک کا منشور تسلیم کیا جاتا ہے۔ شادی شدہ (لیکن علیحدہ) تین بچوں کی ماں بیٹی فریڈن لکھتی ہیں۔ "لیکن اب میں نے یہ سُننا شروع کر دیا ہے جو پہلے میں کبھی بھی سُننا نہیں چاہتی تھی۔ اُن عورتوں کے خدشے اور جذبات کی آواز جو ہماری تحریک کو شبہے کی نظر سے دیکھتی تھیں۔۔۔۔ نسوانی لبریشن کا پہلا دور ختم ہو گیا ہے۔ ہم نے کچھ انتہا پسند نعرے بھی دیئے تھے۔ اُس کا اثر بھی ہوا۔ لیکن اب وقت آگیا ہے کہ ہم مرد اور عورت کے باہمی رشتوں میں، اور خاندان اور کیریر کے بیچ توازن قائم کریں۔۔۔ ہم نے یہ خیال پیدا کیا کہ کیریر کو خاندان اور امومت سے برتر مقام حاصل ہے اور اگر دونوں میں انتخاب ناگزیر ہو تو ہمیں کیریر کو ترجیح دینی ہوگی۔ خود مختار کیریر ہی عورت کو مرد کے غلبے، خاندان کی گھٹن اور اولاد کی نام نہاد فطری خواہش سے آزاد کر سکتا ہے۔۔۔ اور حالت یہاں تک پہنچی کہ اُس کے لئے کسی ایک مرد سے شوہر کے روپ میں جنسی رشتہ قائم کرنا لازمی نہیں گیا۔ شائد کسی مرد سے جنسی رشتہ ضروری نہیں۔"

اس کتاب سے اُن انقلابی عورتوں میں غم اور غصّہ کی لہر دوڑ گئی جو نسوانی لبریشن کو محض جنسی انقلاب اور جنسی سیاست کا ہی نعم البدل مانتی ہیں۔ اُن کے خیال میں مس فریڈن نے یہ کتاب لکھ کر نسوانی لبریشن کی تحریک سے غدّاری کی ہے اور وہ اس تحریک کے مخالفین کی زبان بولنے لگی ہیں۔ اُس نے عورت کو پھر سے مرد کے جنگل میں بند کر دیا ہے۔ اور خاندان اور اولاد کے نام پر عورت کو مرد کا غلام بنا دیا ہے۔

آج امریکا اور یورپ کے ممالک کی زیادہ تر عورتیں یہ محسوس کرنے لگی ہیں کہ زندگی جسے "جینا" کہتے ہیں پیچھے چھوٹتی جا رہی ہے۔ وہ اکیلی عورتیں ہیں یا کام کاجی شادی شدہ عورتیں۔ اکیلی عورتیں چاہتی ہیں کہ اُن کی شادی ہو، اولاد ہو۔ خاندان ہو۔ کام کاجی عورتیں چاہتی ہیں کہ اب انھیں بھی "گھر بسانا" چاہئے۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ جس کیریر کے لئے انھوں نے "تولید" کو تیاگ دیا تھا شائد اب وہ اُس کے قابل ہی نہیں رہیں۔ "جس آزادی"، انفرادیت اور ذات کی تکمیل کے حصول کے لئے ہم نے مرد کی قید سے رہائی حاصل کی تھی وہ دفتروں اور کاروبار کے جارحانہ مقابلے اور غیر ذاتی ماحول میں پھنس کر دم توڑ رہی ہے۔۔۔۔ ہم سُوپر وومن، بن گئیں لیکن انسانی جذبے سے عاری ہو گئیں۔ اسی جذباتی خلا کے باعث ہم نے مردوں کے غلبے کے خلاف بغاوت کی تھی۔"

جب بھی کوئی شادی شدہ عورت کام کرتی ہے تو شوہر اور بیوی کے رسمی رول میں کشمکش لازمی ہے۔ جب بھی بیوی اپنی معاشی زندگی کے بارے میں زیادہ تشویش کرے گی تو اُس کے ازدواجی رول میں تبدیلی آئے گی ہی۔ آج کام کاجی عورتیں کیریر کے ساتھ وہی تصور جوڑتی ہیں جو کبھی وہ اپنے محبوب کے ساتھ جوڑتی تھیں۔ وہ کام کاج کے دوران دوسرے مردوں کے میل جول میں آتی ہیں تو اس رومانی تصور کا ایک کلائمکس بن جاتا ہے جس میں شوہر اُس کی "اسٹیٹس" میں فٹ نہیں ہوتا۔ اور اس ساری صورتِ حال میں جنس کا ایک نیا روپ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ نسوانی لبریشن کو جنسی انقلاب سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اور اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عورت اور مرد جب جذباتی طور پر ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں تو انھیں اپنی انا" ذات اور آزادی پر باہمی توازن کے لئے کچھ نہ کچھ روک لگانی ہی پڑتی ہے۔ عورت ہو یا مرد خود مختار ذات اور عمل کو اوّلیت دے کر شادی اور خاندان کی زندگی کو مضبوط اور پُرمسرت نہیں بنایا جا سکتا۔ اگر خود مختار شخصیت کی خواہش زیادہ قوی ہوتی تو حالات اور بھی مشکل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ امومت اور زوجگی اس کے راستے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ ایسی عورتیں زندگی کو اس کی مکمل جامعیت میں جینا چاہتی ہیں۔ اُن کے لئے بچوں کی پرورش یا گھریلو کام کاج یا سیکنڈ سیکس، کی حیثیت نہ صرف ادنیٰ درجے کا کام ہے بلکہ مرد کے غلبے، کا بھی ثبوت ہے۔

جنسی سیاست پر کچھ عورتوں نے زیادہ زور دیا ہے جس کا انجام یہ ہوا کہ نسوانی لبریشن کے جو بنیادی مسائل تھے عام لوگوں کی توجہ ان سے ہٹ گئی۔ یہاں تک کہ جنسی سیاست اور آزاد جنسی عمل کو لبریشن سمجھا جانے لگا۔ مس فریڈن کے خیال میں ماس میڈیا نے بھی جنسی سیاست کا ہی پرچار کیا ہے اور نسوانی لبریشن کے بارے میں کئی طرح کی غلط فہمیاں پھیلائی ہیں۔ بہت سی عورتیں ان غلط فہمیوں کا شکار ہو گئیں اور لاکھوں نے ایسے انتہا پسند نعرے دیئے کہ بنیادی مسئلوں سے ہم دور ہوتے چلے گئے۔ لیکن اب ہم اس دور سے آگے نکل چکی ہیں۔

جنسی رویئے اور عمل کے بارے میں کوئی عورت کیا رائے رکھتی ہے یا اُس کی جنسی زندگی اور پسند کیا ہے یہ اُس کا ذاتی معاملہ ہے۔ اخلاق یا مذہب کی رو سے اُس پر کوئی فیصلہ عائد کرنا صحیح نہیں۔ اگر مرد غالب معاشرہ ہونے کے باعث مرد دہرے جنسی عمل کو صحیح کہتے ہیں تو اس کی مخالفت ضرور ہو گی اور نفسیاتی، سماجی، معاشی اور حیاتی رشتوں کے بارے میں سوالات اُٹھائے جائیں گے۔ لیکن ان رشتوں کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ نئی سمت اور نئے معنی دیئے جا سکتے ہیں۔

مس فریڈن کا سوال ہے کہ کیا عورت اپنی حیاتیاتی حیثیت کی نفی کر سکتی ہے؟ کیا وہ مرد سے مکمل طور پر آزاد ہو سکتی ہے، کیا اولاد سے نجات یا خاندان کے دائرے سے باہر رہ کر زندگی بسر کرنا اُسے خود مختار اور آزاد بناتا ہے؟ جنسی سیاست نسوانی لبریشن کا بنیادی مسئلہ نہیں۔ اُسے مرکزی مسئلہ بنانے سے لبریشن کے بارے میں کئی طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہوئے ہیں اور مخالفین اس کے خلاف پرچار کرتے ہیں۔ عورتوں کی قوت کمزور ہوتی ہے۔ بنیادی مسئلہ جنسی سیاست نہیں معاشی اور سماجی مساوات ہے۔ انسانی انصاف ہے۔ تعلیم کے مساوی مواقع مہیا کرنا ہے۔ ایک جیسے کام کے لئے مرد اور عورت کو مساوی معاوضہ اور سہولیات باہم پہنچانا ہے۔ اور اس پالیسی کو ختم کرنا ہے کہ کچھ کام صرف مرد ہی کر سکتے ہیں اور کچھ کام محض عورتوں کے لئے ہی مخصوص ہیں۔ مس فریڈن نے مساوی حقوق ترمیم کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم فوج میں بھرتی ہوں اور وہ کام کریں جو براہِ راست جنگ میں شرکت کے لئے ضروری ہیں۔ مردوں کی غالب حیثیت کے باوجود عورتوں کو کچھ خاص سہولتیں مہیا ہیں اور اُنھیں تحفظ بھی حاصل ہے۔ انتہا پسند نعروں سے ہم اِن سے محروم نہیں ہونا چاہتیں۔ اس نے کہا کہ میں نے اپنی کتاب

میں یہ لکھا ہے کہ عورت

کو تولید کی خاطر مرد کے توسط سے سمجھا جا رہا ہے۔ یہ صحیح نہیں میں اس یک طرفہ رویئے کی مخالفت کرتی ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مرد عورت کا دشمن ہے۔ اِس لئے عورت کو بھی مرد مخالف ہونا چاہیے۔

ہمارا سماج دو جنسی ہے یک جنسی یا عدم جنسی نہیں۔ نسوانی لبریشن انسانی لبریشن کا ہی حصہ ہے۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب تک دیکھیں کہ اس سماج میں مردوں پر کیا بیت رہی ہے جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں کیا اس کا اثر مردوں پر نہیں پڑ رہا۔ معاشی بدحالی، استحصال، سماجی ناانصافی، سیاسی کرپشن، نوکرشاہی کی نااہلیت، جنگ کا خطرہ۔ اِن سب سے عورت اور مرد، بچے اور بوڑھے سب ہی متاثر ہو رہے ہیں۔ اِن کا اثر ہمارے کام کاج اور خاندان اور دوسرے انسانی رشتوں پر بھی پڑ رہا ہے۔ اس لئے مردوں کی لبریشن بھی ضروری ہے۔ ہمیں اس امر کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ عورت پر جبر کے ساتھ ساتھ مرد بھی انسان کش حالات کا شکار ہو رہا ہے۔ اب ہم اس موڑ پر پہنچ چکے ہیں جہاں سے ہمیں عورت اور مرد کے مختلف النوع رشتوں کو قوانین اور احساس کے ساتھ ساتھ فرد اور خواہش کے دائرے میں نئے سرے سے استوار کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے یہ مسئلہ محض جنسی انقلاب، سیاست یا لبریشن تک ہی محدود نہیں۔ اس کا ایک ہمہ گیر ماحول ہے۔

مس فریڈن کی اگلی کتاب

کا یہی موضوع ہے۔

وہ لکھتی ہیں کہ اب ہم یہ محسوس کرتی ہیں کہ نسوانی لبریشن کی تحریک اولین دور کے مطالبات کی بنیاد پر مردوں اور بچوں کے ساتھ یا اُن کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہیں۔ نیا دور اپنے اپنے کاروبار میں کامیابی اور خاندان کی خوشی دونوں کو ایک ساتھ لے کر آگے بڑھے گا۔ ہم جانتی ہیں کہ خوشحالی کے اپنے دباؤ ہوتے ہیں اور مرد ان دباؤ کے بوجھ سے امراضِ قلب، فالج یا کینسر یا دوسرے امراض کا شکار ہو رہے ہیں۔ کیا عورتیں بھی اس دور سے گزرنے کے بعد واپس لوٹیں گی؟ وقت آگیا ہے کہ ہم نسوانی لبریشن کی تحریک کے ارتکاز پر از سر نو غور کریں۔ ہم نے کیا پایا اور کیا کھویا؟ ہمارا اگلا قدم کیا ہوگا؟ ہمیں اپنے وجود اور اپنی ذات کی حقیقت کو پہچاننا ہے۔ اور اپنی بنیادی شاخوں میں توازن قائم کرنا ہے۔ یہ شاخیں ہیں عورت کی ازلی قوت، شناخت اور ذاتی حیثیت کے ساتھ ساتھ شادی، خاندان اور اولاد سے منسلک نئے رشتے۔ یہ توازن عورت کو ہی نہیں مرد کو بھی آزاد کرے گا۔ اور ایک ایسے سماج کی تشکیل ہوگی جو مساوات، انسانی حقوق اور انصاف پر مبنی ہوگا۔" مرد ہمارے محبوب ہیں، ہمدم ہیں۔ ہمارے کام کاج کے ساتھی ہیں۔ ہمارے کام کاج کے ساتھی ہیں۔ ہمارے دوست اور غم خوار ہیں۔ ہمارے بیٹے ہیں۔ وہ کبھی کبھی ہمارے دشمن بھی ہیں اور جو ہمارے دشمن ہیں۔ اُن کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہوگا۔ لیکن جو ہمارے خیر اندیش ہیں اور ساتھی ہیں اُن کے ساتھ مل کر ایسے سماج، ایک ایسے ماحول، ایک ایسے نظام کو قائم کرنا ہوگا جو ایک دوسرے کی انفرادیت کو تسلیم کرتے ہوئے، اُن کی عزت کرتے ہوئے، برابری کا درجہ دیتے ہوئے، ایک دوسرے کو پیار کرتے ہیں۔" یہ ہے اس نئی فکر کا پیغام آج کے ہر مرد اور ہر عورت کے نام۔

کیا آپ نے
اسر کا افسانوی مجموعہ
کینوس کا صحرا پڑھا ہے۔؟
قیمت 15 روپئے

خواتین کا مشاعرہ

ہاجرہ بیگم

۱۹۴۸ء سے میں آل انڈیا وومنز کانفرنس کی ماہانہ میگزین "روشنی" کے اردو اور ہندی ایڈیشن کی ایڈیٹر رہی۔ یہ رسالہ ہم نے بمبئی سے نکالا تھا لیکن ۱۹۴۸ کے آخر میں مجھے کچھ وجوہات سے لکھنؤ آنا پڑا اور اب "روشنی" کے دفتر کی فکر ہوئی۔

ان دنوں لیڈی وزیر حسن (اپنے بھائی کی والدہ) لکھنؤ وومنز ایسوسی ایشن کی صدر تھیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ ایسوسی ایشن کی عمارت میں ایک کمرہ "روشنی" کے دفتر کے لئے دے دیں۔ انھوں نے بہت خوشی سے منظور کر لیا۔ مگر ایک شرط رکھی کہ میں ایسوسی ایشن کے کام میں ان کی مدد کروں۔

لیڈی وزیر حسن کی خود بہت معمولی تعلیم تھی لیکن تعلیمی اور ادبی کاموں سے انھیں گہری دلچسپی تھی۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگیں "اس مہینہ چلو عورتوں کا مشاعرہ کریں۔ میں نے تعجب سے پوچھا "کیا اتنا شاعر خواتین ہیں جو کچھ پڑھ سکیں اور کیا سننے کا ذوق رکھنے والی اتنی بہنیں ہیں کہ مشاعرہ کامیاب ہو؟" لیڈی صاحب خوب ہنسیں اور بولیں "سنبھالے نہ سنبھلے گا" اور انھوں نے مجھے تقریباً ۲۰ شاعرات کے نام اور پتہ پکڑا دئے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا "اے یہ بڑی غزبلی ہیں۔ جا جاکر بلانا پڑے گا۔ اب مجھ پر اور دوسری مددگار بہنوں پر یہ ذمہ داری آپڑی کہ لکھنؤ کے پرانے پرانے محلوں نخاس، مولوی گنج، حسین آباد چوک وغیرہ میں سائیکلیں سنبھالے شاعرات کو ڈھونڈتے پھریں۔

جو خصوصی بیگمات تھیں ان کے یہاں لیڈی صاحب خود موٹر سے جاتی تھیں اس کا بھی "پروٹوکول" تھا محلہ کی گلی میں گھستے ہی ایک جم غفیر لڑکے لڑکیوں کا موٹر پر اس طرح ٹوٹتا تھا جیسے مٹھائی پر مکھیاں گرتی ہیں۔ "یہ کس کی موٹر ہے؟" "اماں کوئی بڑا آدمی آیا ہے" "کہہ کے گھر جائیں گے" "ہٹ سالے۔ نواب صاحب کے اور کس کے" لیڈی صاحب ڈرائیور سے کہتیں "جاؤ زنان خانے میں کہلوا دو لیڈی وزیر حسن آئی ہیں" کوئی دس منٹ میں ایک میلی کچیلی خادمہ پھٹا دوپٹہ اوڑھے نکلتی موٹر میں جھانک کر آداب کرتی اور ڈیوڑھی میں سے ہو کر اندر لے جاتی۔ بڑے سے صحن کے بیچوں بیچ ایک حوض ہوتا جس میں رنگ برنگے ٹوٹی "مدار دتلی غائب۔ لوٹے کٹورے انگڑائیاں لیتے ہوتے۔ ادھر ادھر تین مانگ یا بغیر ادوائن کی پائنتی "مدار کی کھٹولیاں آرام کرتی ہوتیں۔

ہم لوگوں کو دالان میں لے جایا جاتا جہاں بچھے ہوئے تختوں میں سے ایک پر سفید سوزنی اس بات کا اشارہ کرتی کہ ہمارے لئے بچھائی گئی ہے۔ کچھ انتظار کے بعد صاحب خانہ نکلیں۔ فرشی پائجامہ قمیص۔ لکا دوپٹہ پہنے ہوتے (عمر خواہ کچھ بھی ہو) لیڈی صاحب اور صاحب خانہ گلے ملتیں۔ سارے خاندان کی خیریت حال احوال پوچھا جاتا۔ پان ڈلی سے تواضع ہوتی پھر آمدم برسر مطلب، مشاعرہ کی دعوت دی جاتی۔

اب مشاعرہ کا حال سنیئے۔ اندر باقاعدہ چاندنی مسند، گاؤ تکئے وغیرہ بچھے تھے۔ باہر قناطیں تھیں۔ آنے والی بہنیں تانگوں پر پردے باندھ باندھ کر یا بعض پردے والی موٹروں سے اتر اتر چلی آتی تھیں۔ ہال کمرہ سننے والیوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ پڑھنے والیاں "اختر، قمر، حیا" "درد" اور نہ جانے کون کون بڑے بڑے پائنچوں کے پاجامے یا کلی دار غرارے پہنے۔ گوٹ ٹھپے کے دوپٹہ۔ شلوکے یا قمیص۔ کانوں میں بجلیاں۔ جھالے۔ وغیرہ آراستہ پیراستہ آتی تھیں "تسلیمات، کورنش، آداب وغیرہ کہہ کر بیٹھتی جاتی تھیں یا آپس میں گلے ملتی تھیں۔

اب میر مشاعرہ سے صدارت کے لئے کہا گیا حالانکہ پہلے ہی طے ہو گیا تھا کہ میر مشاعرہ کون ہوگا لیکن لکھنؤ کا "تکلف کیسے چھوٹ سکتا تھا" اے میں اس لائق کہاں۔ کسی اور کو یہ عزت دیجئے۔" "جی نہیں آپ کے سامنے تو اور کا ہونا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ وغیرہ۔

"خیر اب مشاعرہ شروع ہوتا ہے اور میر مشاعرہ ایک شاعرہ کو اپنا کلام سنانے کو کہتی ہیں۔ سنانے کا طریقہ سن لیجئے۔

جس شاعرہ کا نام پکارا جاتا وہ محفل کو آداب کر کے اپنے ساتھ آنے والی نوکر سے پان کی ڈبیا لے کر سب پڑھنے والیوں کو پیش کرتیں۔ پھر اسی عورت سے جزدان لے کر بیاض نکالتیں۔ آپ سوچیں گے کچھ سنانے کو جی نہیں پہلے وہ اجازت لیتیں کہ ان کی شاگرد کچھ سنائیے۔ چنانچہ ۱۲/۱۴ سال کی بچی دوزانو بیٹھ کر چند اشعار پیش کرتی۔ اب پھر ان کی ملازمہ جزدان کھولتی اور اس بار "تلہ دانی" میں سے شاعرہ ان کی عینک نکالتیں اور اب وہ "اجازت ہے؟" کہہ کر اپنا کلام سنائیں۔

سب سے اول تو حمد یا نعت یا حضرت علی اور آل رسول کی شان میں چند اشعار ہوتے اس کے بعد وہ مشاعرہ میں اپنی پیش کش نہایت خوش الحان سے سنائیں۔

کہنے کو تو سب سے کہہ دیا گیا تھا کہ آپ کی نظم یا طرح عورتوں کی اصلاح کے بارے میں ہو لیکن جب چند روکھے پھیکے اصلاحی اشعار پڑھ دئے تو پھر پڑھنے والی کو عشق اور عاشقی کی داستان سنانے سے کون روک سکتا تھا۔ اور کیا آوازیں تھیں کیا گلے تھے۔ مردانہ مشاعرہ میں تو سننے کو بھی نہیں ملیں گے۔ اور داد بھی کیا ملتی تھی واہ واہ۔ قربان جائیے، جگر کے پار ہو گیا، منہ چومنے کے قابل ہے، اے ہے کلیجہ چھلنی ہو گیا۔ چشم بد دور، کیا مصرعہ پڑھا ہے!" جس شاعرہ کا کلام جم جاتا وہ پڑھتی چلی جاتی تھیں اور "مکرر، مکرر" چند اشعار اور سے ہال گونج اٹھتا تھا اور ہم بھی گم ہو کر ایسے دیکھ رہے تھے کہ جیسے کسی فلم کا سین۔ پردۂ سیمیں پر نظر آ رہا ہو، بڑی دیر تک یہ مشاعرہ چلتا رہا اور نہایت شکل سے اس محفل کو برخاست کیا گیا۔

آپ ضرور چاہیں گے کہ یہ بھی بتایا جائے کہ مشاعرہ میں پڑھا کیا گیا لیکن سچ تو یہ ہے کہ اتنے لمبے عرصہ کے بعد مجھے یاد بھی نہیں کہ شعر جو پڑھے گئے وہ کیا تھے۔ البتہ آپ کو کچھ اندازہ دینے کے لئے لکھنؤ کی شاعر خواتین کا کلام کیا ہوتا تھا میں چند خواتین کے ایک ایک دو دو شعر لکھے دیتی ہوں۔

حجاب۔ تخلص۔ نام عسکری۔ اپنے مکان

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

- ادبی رسائل کو سیاست دانوں سے روپیہ نہیں ملتا۔
- ادبی رسائل کو اشتہارات نہیں ملتے۔
- ادبی رسائل کو سیکس کے اشتہار اور دواؤں سے آمدنی نہیں ہوتی۔
- ادبی رسائل کو بعض ایسی سرکاری سہولتیں بھی نہیں ملتیں جو غیر ادبی رسائل کو ملتی ہیں۔
- ادبی رسائل کو عام لوگ نہیں خریدتے۔
- ادبی رسائل کے خریدار صرف وہ لوگ ہو سکتے ہیں جن کو ادب سے دلچسپی ہے۔ جو ادب کے طالب علم ہیں۔ یا ادب کے اُستاد ہیں۔ افسانہ نگار، شاعر، مضمون نگار، ناقد۔
- اسکول، کالج اور لائبریریاں۔

لائبریریاں کم ہیں۔ بہت کم طالب علموں کو ادبی رسائل خریدنے کا شوق ہے۔

اور اردو کے اکثر اساتذہ۔ یہ سمجھتے ہیں کہ اعزازی کاپی حاصل کرنا ان کا حق ہے اور ہر مصنف اور ایڈیٹر کو چاہیئے کہ انھیں اعزازی کاپیاں بھیجتا رہے۔ ان میں سے بعض لوگ تو رسید تک سے نوازنا کسر شان سمجھتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ اسی درخت کو کاٹ رہے ہیں جس کی شاخ پر ان کا آشیانہ ہے۔ ان میں سے بعض لوگ یہ کہتے ہیں۔ بھائی میرا زمانہ تو گزر گیا یعنی انھیں نوکری مل گئی مزے میں گزر بسر ہو رہی ہے۔ انھیں اس سے کیا کہ اردو اور ادب فن اور معاشرہ صحیح صالح رہتا ہے یا جہنم رسید ہو جاتا ہے۔

حالانکہ ان میں سے اکثر لوگوں نے اس بوڑھے کی کہانی پڑھی ہو گی جس سے کسی مسافر نے پوچھا تھا "بابا" جب تک یہ پیڑ بڑا ہوگا اور پھل دے گا اس وقت تک تو تم مٹی میں مل چکے ہو گے۔" بوڑھا مسکرایا اور بولا "بیٹا یہ درخت ہمارے لئے نہیں آئندہ نسل کے لئے ہے۔"

تو بھائی اساتذہ کرام آپ سے گزارش ہے کہ ذرا اس مسئلے پر بھی غور کیجیئے۔

ایک اور مسئلہ ہے وہ ہے معاوضے کا۔ کوئی ادبی رسالہ ہندستان میں اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ لکھنے والوں کو معاوضہ دے سکے۔ وجہ صاف ہے۔ اردو میں جو لکھنے والے ہیں وہی پڑھنے والے ہیں۔ ادیب ہی قاری ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم ہیں جو صرف پڑھتے ہیں لکھتے نہیں۔

لکھنے والوں کی اکثریت زر سالانہ دینے سے احتراز کرتی ہے۔ لہٰذا رسالے والوں کے پاس کبھی بھی اتنا سرمایہ اکٹھا نہیں ہوتا کہ ادیبوں کو معاوضہ دے سکے۔

حالانکہ اگر ہر ادیب رسالے کا خریدار بن جائے تو رسالے والے لکھنے والوں کو معاوضہ دے سکتے ہیں۔ اس طرح امداد باہمی کی ایک ایسی صورت پیدا ہو سکتی ہے جہاں رسالہ بھی زندہ رہے اور ادیبوں کو معاوضہ بھی ملتا رہے۔

اور رسالہ اگر پابندی سے نکلتا رہے اور اُس کے پاس اس کی توسیع اشاعت کے وسائل ہوں تو پھر ادب کا حلقہ اثر بڑھ سکتا ہے اور صاف ستھرے رسائل گروہ بندیوں اور اسی طرح کی کئی لعنتوں سے دامن بچا کر ادب، فن اور معاشرے کی بہتری کے لئے کچھ کر سکتے ہیں۔

چنگاری آفسٹ پر پابندی سے نکل رہا ہے۔ اگر اس کو ایک ہزار خریدار مل جائیں تو یہ ادیبوں کو معاوضہ بھی دے سکتا ہے۔ مگر اس کے لئے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔

کروڑوں کی اردو آبادی میں کیا ایک ہزار خریدار نہیں بن سکتے۔؟

غزلیں

یارب ساری جھیلوں کو آئینہ کر دے
یا پھر چاند ستاروں کو نابینا کر دے
بے حس ہے ان ٹھہرے دریاؤں کا پانی
بھیج اک ایسی لہر جو پار سفینہ کر دے
ختم ہوا جاتا ہے سارا حُسن غزل کا
آنکھوں کو ساغر، جسم کو مینا کر دے
جس پیشانی پر سورج نے دیا ہے بوسہ
اُس پیشانی کا گلرنگ پسینہ کر دے
ہجر کا غم وہ جادوگر ہے، پریت نگر کا
جو دن کو پھیلائے اور مہینہ کر دے
برسیں پھول تو دنیا حق جتلائے اپنا
تیر چلیں تو آگے میرا سینہ کر دے
جس نے ہجرت کی ہے نفرت کی نگری سے
میرے دل کو اس کے لیے مدینہ کر دے
باتیں بہت قتیلؔ، مگر اس ڈر سے چپ ہوں
یہ واعظ دشوار نہ میرا جینا کر دے

کانچ کی چادر سب کے پاس ہے
آج یہی سب کا لباس ہے
ہم نے صبر کے گھونٹ پی لیے
کیا تلخی ہے کیا مٹھاس ہے
ندی نہیں دو اشک چاہئیں
ہم میں اک مفلس کی پیاس ہے
کسی پیڑ پر نہیں چاندنی
مَن پنچھی کتنا اُداس ہے
بھر لے اپنے خون سے
خالی جس جس کا گلاس ہے
آج کا ٹھٹھرا ہوا آدمی
اُوڑھے ہوئے خوف و ہراس ہے
سونپ دیے سب غم قتیلؔ کو
قسمت کیا مردم شناس ہے

قتیلؔ شفائی

شہر سخن کی دید غزل ہے
اک روشن خورشید غزل ہے
ذہنوں کا صد رنگ تحیّر
جذبوں کی تجدید غزل ہے
کل بھی یہ معشوق جواں تھی
آج بھی قابلِ دید غزل ہے
اس کے رسیا شیخ و برہمن
دیوالی اور عید غزل ہے
محتسبوں کا خوف ہے جن کو
اُن سے نا اُمید غزل ہے
سب درباری شاعر سُن لیں
مدح نہیں، تنقید غزل ہے
میں ہوں اگلی رُت کا راہی
میری آس اُمید غزل ہے
پیاسو میرے ہاتھ سے پی لو
میری خاص کشید غزل ہے
اپنا عہد قتیلؔ ہو جس میں
اس کا نام جدید غزل ہے

ذہنوں میں اس کا پورا سراپا بھی آئے گا
آتا ہے جو بکھر کے وہ یکجا بھی آئے گا
سورج کے ہمسفر جو بنے ہو تو سوچ لو
اس راستے میں پیاس کا دریا بھی آئے گا
کمرہ ہی بند ہے تو ہواؤں کا کیا قصور
کھڑکی کوئی کھلے گی تو جھونکا بھی آئے گا
ایسا نہیں کہ خشک ملے ہر جگہ زمین
پیاسے جو چل پڑے ہیں تو دریا بھی آئے گا
اس شہرِ بے صدا کی خطا جب ہوئی معاف
مُردے بھی جی اٹھیں گے، مسیحا بھی آئے گا
یہ ہجرتوں کی شب ہے، گھروں سے نکل پڑو
اس کا کرم ہوا تو مدینہ بھی آئے گا
جو دل جلا رہے ہیں مرا، خوب سوچ لیں
اس روشنی کی زد میں اندھیرا بھی آئے گا
شاعر نہیں تو پیر ہی بن جائیے قتیلؔ
پُوجا بھی ہو گی آپ کی، پیسہ بھی آئے گا

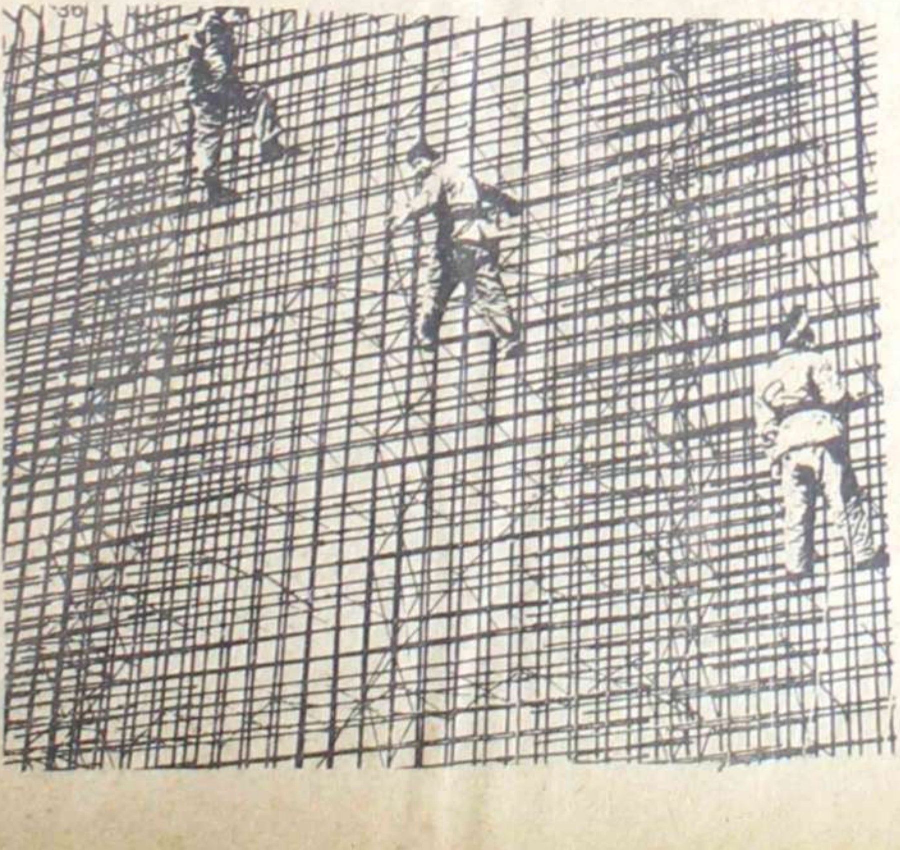

تین نظمیں

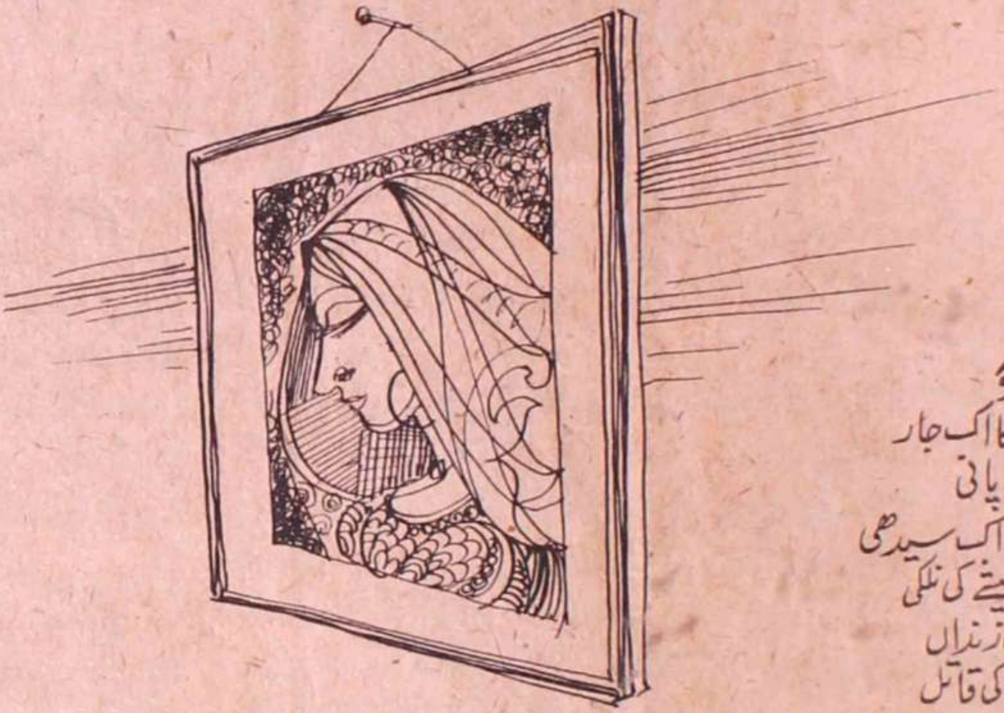

تجربہ

شیشے کا اک جار
جار میں پانی
پانی میں اک سیدھی
شیشے کی نلکی

جار اک زنداں
نلکی پانی کی قاتل
پانی قیدی!
غور سے دیکھو
پانی کی قاتل
شیشے کی نلکی
اپنا توازن کھو بیٹھی ہے
اپنی ہیئت کھو بیٹھی ہے
پانی — !؟
نلکی — !؟
جار — !؟
فکر و فن کی دنیا میں
ترسیل و ابلاغ کے
اُلجھے اُلجھے مسائل
حل نہ ہوئے ہیں
حل بھی نہ ہوں گے!

تیسری آنکھ

ہواؤں کی بے باکیوں نے
کبھی دور تک ہم رکابی نہیں کی
مسافت میں اپنی
وہی تیسری آنکھ کھولو
کہ تم جس سے واقف نہیں ہو
مگر وہ تمھیں دیکھتی ہے
یہی وقت ہے
اس پہ ایمان لاؤ!

ملبے میں دبا ہوا "میں"

میرے گھر پہ
تختی مرے نام کی ہے
مگر اس پہ لکھے ہوئے ہیں
کئی اور نام

اجنبی سے —
جنھیں میں نہیں جانتا
وہ مجھے
میرے الفاظ میں ڈھونڈ لیں گے

ظہیرؔ غازی پوری

باعثِ تحریر آنکہ.....

سرفراز صدیقی

میرا ذریعہ معاش چونکہ کتابت ہے۔ پچھلے دنوں اسی جستجو میں اُردو کے چند سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں مجھے اپنے دیگر ہم پیشہ افراد بھی ملے جن کی کس مپرسی اور بے چارگی نے کافی متاثر کیا اور کچھ میرے ذاتی تجربات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خاص طور پر سرکاری اردو اداروں کے کارکنان کس طرح خوشنویسوں کا اقتصادی، ذہنی اور روحانی استحصال کر رہے ہیں، یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ اُردو زادے جو دن رات اُردو کی ترقی کے لئے سرگرداں ہیں، کاتبوں کا استحصال کر کے اُردو کو فروغ دے سکیں گے؟

مندرجہ ذیل تحریر میں نے اپنا ایک ذاتی تجربہ قلم بند کیا ہے، انداز قدرے طنزیہ ہے۔ دراصل یہ ایک خط ہے جس میں ایک سرکاری اردو ادارے کے ایک افسر کو مخاطب کیا گیا ہے۔ قارئین چنگاری کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

میں کہ سرفراز صدیقی کاتب ابن کاتب (ولائے نصیب) آپ سے مخاطب ہوں جس کی پیشی چند روز قبل آپ کے حضور ہو چکی ہے۔ بنائے پیشی وہ سمن تھا جو کہ آپ کی عدالت سے صادر ہوا تھا جس کی رو سے ایک کتاب برائے کتابت ناچیز کا انتظار فرما رہی تھی۔ البتہ اس امر کا حیرت انگیز پہلو یہ تھا کہ سمن کے اجرا کی تاریخ ۱۵، پیشی کی تاریخ ۱۷ اور پوسٹنگ کی تاریخ ۲۰ تھی۔ چنانچہ لازم ہے کہ کاتب صاحب کشف و کرامات بھی ہو۔

بہر کیف اپنی بے مائیگی پر حیران و ترساں، بہ ہزار دقت ایک طویل اور شدید سفر کر کے حاضرِ عدالت ہوا۔ پہنچنے پر میرے لئے حسرت ناک اوروں کے لئے عبرت ناک انکشاف یہ ہوا کہ مذکورہ کتاب اہلِ کتاب کی جولانیوں اور فدوی کے انتظار کی تاب نہ لا کر وقت سے پہلے ہی کسی دارالامان کی طرف ہجرت فرما گئی ہے اور اب فدوی کے نام کچھ مرمت کا کام برنائے غریب نوازی الاٹ کر دیا جائے گا تو اس ضمن میں گزارش ہے کہ یوں تو موچی اور کاتب میں ایک بنیادی فرق موجود ہے کہ موچی کو اپنی محنت کے معاوضے کا ذرا بھی انتظار نہیں کرنا پڑتا جب کہ کاتب اپنا محنتانہ وصولنے کے لئے نہایت فرماں برداری سے علامہ کے اس مصرعے (یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم) کی تفسیر بن جاتا ہے۔

یقینِ محکم اور محبت کے جذبے تو خیر واجبی سے مضرت رساں ہیں۔ لیکن زیادہ اذیت ناک معاملہ 'عمل پیہم' کا ہے اس سے کاتب کے پیروں میں چھالے بھی پڑ سکتے ہیں۔ بھوک، پیاس اور موسم کی شدت سے زبان بھی باہر آ سکتی ہے اور کہ ماہر کلیدیات پطرس بخاری کے کتوں میں ایک نئی قسم (آشفتہ حال وے خوش خط کتے، کے اضافے کا بھی امکان ہے۔ علاوہ بریں دوسرے اور تیسرے درجے کے خداوندانِ نعمت (جن کی جنبشِ قلم کے بغیر کوئی بھی خوانِ نعمت شرمندۂ معنی نہیں ہو سکتا) کی خوش فعلیوں اور سر مستیوں سے عاجز آ کر اعلیٰ افسروں کے کشادہ مگر بند کمروں کی طرف دیکھ کر ایک گرم آہ (شدید گرمی میں سرد آہ کا تصور ممکن نہیں) یوں بھر سکتا ہے ؎

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لئے
بادلو ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لئے

مگر صاحب یہ سیاہ قلب بادل بھلا ہٹنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں؟ پھر بھی کوئی آہ ان بادلوں کی نظر سے بچ بچا کر فرش سے عرش تک پہنچ بھی جاتی ہے تو عرش کے اسرار و طلسمات میں گم ہو جاتی ہے کیونکہ یہ اسرار و طلسمات فہم انسانی بلکہ فہم خوشنویسی سے تو یقیناً بالاتر ہیں۔

تو جناب خاکسار کو افسوس ہے کہ وہ پرانی کتابوں کی مرمت کا اپنے کو اہل نہیں پاتا۔ ٹاٹ میں مخمل یا مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگانے کا اس ناچیز میں سلیقہ نہیں۔

فدوی گستاخی کی معافی نہیں چاہے گا کہ اس سے گستاخی کے عمل اور ردِ عمل میں خواہ مخواہ شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہاں اگر آپ کو کسی کتاب کے لئے خوشنویسی کے ساتھ تھوڑا بہت قرینہ اور شعور جیسی نالائقیاں بھی درکار ہوں تو بندے کو یاد فرمائیے گا۔ بشرطیکہ (REPAIRING) کا کام نہ ہو (ویسے اس کا امکان نظر نہیں آتا) پھر بھی!

چراغ کی خصوصی اشاعت
مجروح سلطانپوری
شخصیت اور شاعری
ترتیب: شاہد ندیم
چراغ محب بک ڈپو۔ پوسٹ بکس ۱۳۰۱۶ — بمبئی ۴۰۰۰۰۳

پندرہ روزہ "چنگاری" دہلی اور اُردو کے تمام علمی، ادبی معیاری رسائل اور کتابیں ہمارے یہاں دستیاب ہیں۔ بہار میں اردو کتابوں کا سب سے بڑا مرکز جو صرف معیاری اور اعلیٰ ادب کی توسیع اشاعت میں منفرد مقام رکھتا ہے۔
آزاد کتاب گھر۔ ساکچی بازار
جمشید پور (بہار)

غزلیں

بیچا نہ ہم نے دل نہ خریدار تک گئے
جو کم عیار تھے وہی بازار تک گئے
سایہ کہاں کا چاروں طرف دھوپ چھا گئی
جب تک ہم اس کے سایۂ دیوار تک گئے
ہر بار کھینچ لائی ہمیں غیرت جنوں
سو بار یوں تو ہم بھی دربار تک گئے
کتنے عزیز ہیں یہ مسیحا کو کیا خبر
وہ زخم دل جو لذت آزار تک گئے
وہ سلسلے بھی کتنے دل آویز تھے کہ جو
زنجیر پائے گیسوئے خمدار تک گئے
اے شانؔ سوچتی ہوں کہ وہ ہاتھ کیا ہوئے
جو شاخ گل کو چھوڑ کے تلوار تک گئے

سیدہ شان معراج

یہ کیسے جانتا اگر شہر میں آیا نہیں ہوتا
یہاں دیوار ہوتی ہے مگر سایا نہیں ہوتا
رسالت کی بنا گر جھوٹ پر رکھی گئی ہوتی
رسولوں کو کبھی دنیا نے جھٹلایا نہیں ہوتا
یہ خواب صبح کب کرتے تمنا کی حنا بندی
اگر تاریخ نے اپنے کو دہرایا نہیں ہوتا
جو امرت چھوڑ کر ہم لوگ بھی وش پان کر لیتے
تو اپنے خون میں یہ سانپ لہرایا نہیں ہوتا
میں اپنے قتل کا اس پر کبھی شک بھی نہیں کرتا
اگر وہ مسکراتے وقت شرمایا نہیں کرتے
اگر کچھ آتی اصطلاح سا فرد مینا!
تو میری تشنگی نے مجھ کو بہکایا نہیں ہوتا
جناب قیصر روتے ہیں تو قیصر شوق سے روئیں
ہمارے عہد میں اب کوئی ہمسایہ نہیں ہوتا۔

قیصر صدیقی (رستی پوری)

شہر تھراتا ہے آدھی رات میں
زلزلہ آتا ہے آدھی رات میں
اُف! یہ برفانی درندوں کا مزاج
خون گرماتا ہے آدھی رات میں
بیخودی میں رقص کرتی ہے زمین
آسماں گاتا ہے آدھی رات میں
جانے کیوں رنگ نظام میکدہ
ماند پڑ جاتا ہے آدھی رات میں
اللہ اللہ عصر حاضر کے چراغ
دن نکل آتا ہے آدھی رات میں
آگ پی کر سرد خانوں کا شباب
سب کو جھلساتا ہے آدھی رات میں
روح تو بیدار رہتی ہے مگر
جسم سو جاتا ہے آدھی رات میں
زیب تن کر کے وہ پھولوں کا لباس
روح مہکاتا ہے آدھی رات میں
کہہ رہی ہیں تیرے دل کی دھڑکنیں
سانس رک جاتا ہے آدھی رات میں
گھر کے دروازے پہ یہ لکھا ہے رازؔ
روز وہ آتا ہے آدھی رات میں۔

شفیع اللہ خاں رازؔ اٹاوی

- کب تک اک اشک بہاؤ گے اجالوں کے لئے
- اشک ریزی سے اجالے تو نہیں ملتے ہیں
- اپنے ان کھوئے اجالوں کو اگر پانا ہے
- تو مری بات سنو! اپنے یہ آنسو پی لو!
خون دل اپنی انگلیوں پہ چھڑک کر ہم تم
ان سیہ فام مزاروں کی طرف چلتے ہیں
جن میں دفنائے ہیں خود ہم نے اجالے اپنے
روز و شب جن کی پرستش ہے عبادت اپنی
یہ فلک بوس مقابر، یہ ہمارے مرقد،
جب تلک قید ہیں زندان بقا میں یارو،
ان اجالوں کو رہائی نہ ملے گی ہرگز۔

اقبال انصاری

غزلیں

خشک ہونٹوں پہ کیا ہنسی آئی
ریگ زاروں میں چاندنی آئی
بعد مدت کے آئی یاد تری
وہ بھی جیسے تھکی تھکی آئی۔
پھول کس کے بدن کا یہ مہکا
کدھر سے گناہ کی آئی
ہم صلیبوں کی سمت جاتے تھے
زندگی تو کہاں چلی آئی
میرے شعروں میں وہ بدن جھلکا
چھن لفظوں سے روشنی آئی
کتنے جی دھک ہوگئے ہیں علی،
میرے ہونٹوں پہ جب ہنسی آئی

علی احمد جلیلی

حادثے سب ایک سے ہیں ذکر یہ ہم کیا کریں
پتھروں کے شہر میں شیشے کا ماتم کیا کریں
سبز منظر ایک مدت سے ادھر آیا نہیں
آج تک ٹھہرا ہوا ہے زرد موسم کیا کریں
خوف کی چادر میں لپٹی ہے صدائے بازگشت
پھر ہواؤں کی نظر ہے آج برہم کیا کریں
رفتہ رفتہ مٹ رہے ہیں اس کی قربت کے نقوش
لذت آوارگی ہونے لگی کم کیا کریں
زندگی بھر جس نے اوڑھی تشنہ کامی کی ردا
اس سمندر سے توقع اے جنوںؔ ہم کیا کریں

جنوںؔ اشرفی

عہدِ رسوائی کے سب قصے پرانے ہو گئے
اُس کی کم ظرفی کی چادر تان کر ہم سو گئے
اک نئی لذت سے ہوتے ہی گئے ہم روشناس
رات جب یادوں کے شعلوں سے لپٹ کر سو گئے
جاگ اُٹھا میری پلکوں پر ستاروں کا جلوس
ذہن و دل کے سارے گوشے اب منور ہو گئے
جاگتی آنکھوں میں روشن ہیں مہکتی رُت کے خواب
جانے کس ان دیکھی جنت میں ہم آکر کھو گئے
کھلبلیاں وہ کچھ ہے کچھ آپ بھی ہیں شرمسار
کچھ تناؤ کم ہوا، کچھ فاصلے کم ہو گئے
دردِ محرومی شکستِ ذات، کرب آگہی
بھول کر ہم سب کے سب جلووں میں آ کے کھو گئے
یہ عجیب بن باس ہے ہوں گھر میں رہ کر گھر سے دُور
سانحہ کیسا ہوا، اپنے پرائے ہو گئے
بڑھ گیا تھا اس قدر سیلِ ہجومِ آرزو
ننھے بچے کی طرح اس بھیڑ میں ہم کھو گئے
مہدیؔ اپنی جستجو کا ہے مآل اک انتشار
امن کے وہ فاصلے کن وادیوں میں کھو گئے

مہدی پرتاب گڈھی

جب کسی کو اُداس پاتا ہوں
اپنے ماضی میں لوٹ جاتا ہوں
اپنے چہرے سے خوف کھاتا ہوں
آئینے سے نظر چُراتا ہوں
بھول بسری کہانیوں کی طرح
کیا کبھی تجھ کو یاد آتا ہوں
اپنی پلکوں پہ یاد کی شمعیں
شام سے تا سحر جلاتا ہوں
جب بھی لکھتا ہوں تیرے نام سے خط
میز پہ رکھ کے بھول جاتا ہوں
سبز موسم کا چبھ گیا کانٹا
پھر بھی اے دوست مُسکراتا ہوں
چھیڑ کر داستانِ غم
ظرف احباب آزماتا ہوں
کیوں زمانے سے بے تعلق ہوں
آ تجھے رازِ دل بتاتا ہوں
لذتِ درد کی قسم بزمیؔ
رنج و غم کے دیئے جلاتا ہوں

مجیب الرحمٰن بزمیؔ

سب کی آنکھوں کا مر گیا پانی
شہر ویران کر گیا پانی
لوگ پیاسے تڑپ تڑپ کے مرے
جب سے دریا میں بھر گیا پانی
کھیت برسات میں رہے سوکھے
اور صحرا میں بھر گیا پانی
رات بارش بڑے غضب کی ہوئی
شہر در شہر بھر گیا پانی
ہم بھی تنکے کی طرح ساتھ بہے
بہتے بہتے جدھر گیا پانی
وقت تھا چڑھ گیا ہر آنگن میں
وقت آیا اتر گیا پانی
ذرّے ذرّے سے بن گیا صحرا
قطرہ قطرہ بکھر گیا پانی

روشن لال بنارسی

غزلیں

عکس پانی پر ہے چھونے کے لئے بیکل نہ ہو
چاند کو ہاتھوں میں آیا دیکھ کر پاگل نہ ہو
سر پٹکتی ہے مسلسل ہر در و دیوار پر
بے غرض اندھی ہوا میری طرح پاگل نہ ہو
یہ دعائیں مانگتے ہی کٹ گئی عمر طویل
ہو نہ کل سا آج میرا آج جیسا کل نہ ہو
ڈالنے دریا میں جس کو چل پڑے بستی کے لوگ
ڈر رہا ہوں وہ مری ہی نیکیوں کا پھل نہ ہو
جینے مرنے کے لئے کچھ تو بہانہ چاہیے
ڈھونڈ لا اپنی پریشانی کہ جس کا حل نہ ہو
کرب کی لذت سے بھی نا آشنا ہو جائے گا
اپنی اس تیغ انا سے اس قدر گھائل نہ ہو
ڈھونڈتے ہیں ہم بہاروں کی خبر اخبار میں
چاہے سوکھی ڈالیوں پر اک نئی کونپل نہ ہو
ہر بلندی پر بلندی کی طلب باقی رہے
یا خدا! سیماب دوئم ہو کبھی اول نہ ہو

سیماب سلطانپوری

تری تلاش میں نکلی مگر پلٹ آئی
پہنچ کے حد نظر تک نظر پلٹ آئی
یہ تیری یاد نے کیا کھیل مجھ سے کھیلا ہے
تیری گلی میں مجھے چھوڑ کر پلٹ آئی.
صدا تو بیتی ہوئی زندگی کو دے لی ہے
طویل ہجر کی شب ہی اگر پلٹ آئی
چمن میں آج عجب سانحہ ہوا یارو
گلوں کو چھیڑ کے باد صبا پلٹ آئی
مرے جنوں کی خلش خام ہے ابھی شاید
پہنچ کے سرحد صحرا پہ گھر پلٹ آئی
خدا ہی جانے کہ شوریدگی پہ کیا گذری
پٹک کے خانۂ کعبہ پہ سر پلٹ آئی
ہمارے حال پہ ہنستے تو ہو مگر سوچو
ہنسی ہمارے لبوں پر اگر پلٹ آئی

اوم کرشن راحت

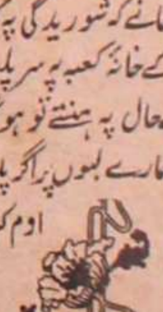

پروانوں کا جنون مچلتا تھا رات بھر
شمع کا جسم غم سے پگھلتا تھا رات بھر
وہ آدمی تھا یا کوئی پاگل فقیر تھا
سگریٹ کے ٹکڑے بین کے پیتا تھا رات بھر
بازار شے میں جس کو کوئی پوچھتا نہ تھا
وہ کرب چیختا ہوا بکتا تھا رات بھر
اک شخص بستروں پہ یہی سوچتا رہا
کس طرح پتھروں پہ وہ سوتا تھا رات بھر
بجلی کے قمقموں کا بھروسہ نہیں رہا
مٹی کے تیل کا دیا جلتا تھا رات بھر

خرم قیومی

چمن میں آج وہ رشک گلاب دیکھا ہے
کہ میری جاگتی آنکھوں نے خواب دیکھا ہے
عبارتیں ہیں خد و خال اسکے چہرے کے
جسے بھی دیکھا ہے محو کتاب دیکھا ہے
یہ غرق جاں کی خبر سچ ہے غم کی بارش میں
جزیرہ دل کا بھی کل زیر آب دیکھا ہے
خدا کرے کہ کوئی تشنہ لب نہ ہو میں نے
سمندروں کو بھی ہوتے سراب دیکھا ہے
تمھارے عہد مقدس میں میری آنکھوں نے
فرات اشک کی خوں کا چناب دیکھا ہے

اسرار حسین امیر

یہ ویرانے میں کیوں مجمع لگا ہے؟
خرد نے پھر جنوں کو پالیا ہے
یہ کیسا دور ہے؟ کیا حشر ہوگا؟
پرندہ بن پروں کے اڑ رہا ہے
بلندی پستیوں سے پوچھتی ہے
گڑھا کیوں لمحہ لمحہ بڑھ رہا ہے
رسن کے ہار نہ پہنو گلے میں
تمھارے پیچھے بھی اک قافلہ ہے
جو بستی میں لٹاتا قہقہے تھا
وہ تنہائی میں جاکر رو رہا ہے
یہ بند کمروں میں نیلی فلم کا شو
ورق تاریخ کا الٹا پڑا ہے
لٹاؤ قہقہے نہ بے تحاشا
ابھی قصہ بہت باقی بچا ہے

وکیل نجیب

سخن در سخن

خامہ بگوش کے قلم سے

• دو بڑے شاعروں میں کشیدگی : • معرکۂ قتیل و ضیا

• شعرا کے جائز اور ناجائز حقوق کا مسئلہ : • ٹی وی اور شاعری کی آبرو خطرے میں

ہم لوگوں کی یہ بڑی عجیب عادت ہے کہ کسی واقعے کو اس وقت تک اہمیت نہیں دیتے جب تک وہ بی بی سی سے نشر نہ ہو جائے اور بی بی سی والوں کی یہ عادت عجیب تر ہے کہ غیر اہم خبروں کو بھی اہم بنا کر پیش کرتے ہیں اور اہم خبروں کو اس طرح نظر انداز کر دیتے ہیں جس طرح محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" کے پہلے ایڈیشن میں مومن خاں مومن کو نظر انداز کر دیا تھا۔ ہمیں بی بی سی والوں سے کوئی شکوہ نہیں کہ وہ تعصب کی عینک کے بغیر دیکھ ہی نہیں سکتے۔ شکایت تو اپنوں سے ہے جو دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے بلکہ آنکھیں بند کر کے انجان بن جاتے ہیں۔ گزشتہ ماہ کی سب سے اہم خبر یہ ہے کہ مشہور شاعر قتیل شفائی کو ٹیلیویژن والوں نے اپنے مشاعروں میں بلانا بند کر دیا ہے۔ یہ خبر اخباروں میں شائع ہو چکی ہے مگر اس پر کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں ہوا۔ اگر یہی خبر بی بی سی سے نشر ہو جاتی تو اب تک معلوم نہیں کتنے احتجاجی جلوس نکل چکے اور جلسے منعقد ہو چکے ہوتے۔ بعض شہروں میں تو ہڑتال تک کی نوبت آ جاتی اور ایم آر ڈی والے بحالیٔ جمہوریت کے پروگرام میں ٹیلیویژن کے مشاعروں کو بھی شامل کر لیتے۔ مگر افسوس کہ اس خبر کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کی یہ مستحق ہے مجبوراً جناب قتیل شفائی کو خود ہی ایک احتجاجی اور مذمتی خط اخباروں میں چھپوانا پڑا۔ یہ خط عکس کی صورت میں شائع ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب قتیل کی تحریر یعنی ہینڈ رائٹنگ بہت عمدہ ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر قتیل صاحب آئندہ اپنے دیوان کی کتابت خود کیا کریں۔ اس طرح یہ فائدہ ہو گا کہ خوشخطی کے نمبر تو بہر حال مل جائیں گے۔

قتیل صاحب کے خط کا پس منظر یہ ہے کہ انہوں نے پاکستان ٹیلیویژن کارپوریشن کے مینجنگ ڈائریکٹر اور مشہور شاعر جناب ضیاء جالندھری کو ایک خط لکھا کہ ٹی وی سے عام شعراء کا جو کلام ساز و آواز کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے، اس کے ساتھ شاعروں کے نام کا اعلان نہیں کیا جاتا لیکن جب ضیاء جالندھری کا نغمہ سنایا جاتا ہے تو اس کے ساتھ ان کے نام کا اعلان دو دو مرتبہ ہوتا ہے۔ قتیل شفائی نے اس صورتِ حال پر افسوس کا اظہار کیا اور یہ تجویز پیش کی کہ کسی شاعر کے ساتھ ترجیحی سلوک نہ کیا جائے اور ہر شاعر کے کلام کے ساتھ اس کے نام کا بھی اعلان کیا جائے۔ ضیاء جالندھری نے اس کے جواب میں قتیل صاحب کو خط لکھا اور ان کی تجویز سے اتفاق کیا اور ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کی کہ ان کا کلام ان کی مرضی کے خلاف ٹیلی کاسٹ کیا جا رہا ہے۔

چاہیے تو یہ تھا کہ اس خط و کتابت کے بعد معاملہ ختم ہو جاتا اور جناب قتیل کا نام نامی ان کے نغماتِ روح پرور کے ساتھ ٹیلی کاسٹ ہونے لگتا لیکن ہوا یہ کہ جناب قتیل کے خلاف انتقامی کارروائی کی گئی اور انھیں ٹی وی کے مشاعروں میں بلانا بند کر دیا گیا۔ ہم اس انتقامی کارروائی کے خلاف شدید احتجاج کرتے ہوئے جناب ضیاء جالندھری سے درخواست کریں گے کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ہم جناب ضیاء سے کسی فیصلے پر نظر ثانی کی درخواست کر رہے ہیں حالانکہ اس قسم کی درخواست کرنے کا ایک موقع پہلے بھی آیا تھا لیکن ہم نے انھیں زحمت نہیں دی۔ موقع یہ تھا کہ ضیاء صاحب نے ٹی وی کا مینجنگ ڈائریکٹر ہونے کے بعد شاعری ترک کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

جناب ضیاء کو یہ سوچنا چاہیے کہ اگر آگرے کا تصور تاج محل کے بغیر، لاہور کا تصور بادشاہی مسجد کے بغیر اور دہلی کا تصور قطب مینار کے بغیر نہیں کیا جا سکتا تو پھر ٹی وی کے کسی مشاعرے کا تصور جناب قتیل شفائی کے بغیر کیسے کیا جا سکتا ہے۔ ادب کی تاریخ کا معاملہ دوسرا ہے مشاعروں کی تاریخ تو ان کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔

اس موقع پر ہمیں ایک شکایت جناب قتیل سے بھی ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے جناب ضیاء جالندھری کے نام جو خط شائع کرایا ہے، اخباری زبان میں اس کا لہجہ دھمکی آمیز ہے پہلے آپ اس خط کا متن پڑھ لیجیے، پھر ہم کچھ عرض کریں گے۔

"جناب ضیاء جالندھری مینجنگ ڈائریکٹر پاکستان ٹیلیویژن کارپوریشن کو ان کی سرکاری حیثیت کے علاوہ ہم سب ایک شاعر کے طور پر بھی جانتے ہیں۔ اس لئے موصوف سے ہماری یہ توقع بے جا نہیں کہ وہ اپنے ادارے کو اپنی تشہیر کے لئے استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ باقی شعراء کے حقوق کا بھی خیال رکھیں چنانچہ انہی خیالات کے اظہار کے لئے میں نے ضیاء جالندھری صاحب کو چند ہفتے پیشتر ایک خط لکھا اور میرے خط کے جواب میں انہوں نے کمالِ فیاضی سے نہ صرف میری گزارشات کو قبول کیا بلکہ اپنی بے بسی اور بے چارگی کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی تحریر فرمایا کہ ان کی مرضی کے خلاف ان کا کلام ٹیلی کاسٹ کیا جا رہا ہے۔ اب یہ تو ضیاء جالندھری صاحب جانیں یا ان کا ماتحت عملہ کہ موصوف کے اس بیان کے بعد بھی ان کا کلام دھڑا دھڑ کیوں ریکارڈ کیا جا رہا ہے؟ مجھے تو اس وقت بھی خوشی ہوئی تھی جب ضیاء صاحب کے ایک نغمے کے ساتھ دو بار ان کا نام ٹیلی کاسٹ کیا جا رہا تھا۔ مجھے اعتراض صرف اس بات پر ہے کہ بیشتر شعراء کے نغمے ان کے نام کے بغیر کیوں ٹیلی کاسٹ ہوتے ہیں اور میں نے اس زیادتی کی نشاندہی کی تھی اور جناب ضیاء نے اس زیادتی کو تسلیم کیا تھا لیکن اس واقعہ کے تھوڑے ہی دنوں بعد نہ جانے کیا ہوا کہ لاہور ٹی وی نے مجھے اپنے مشاعروں میں مدعو کرنا چھوڑ دیا جبکہ اس سے پہلے کوئی بھی مشاعرہ میری شمولیت کے بغیر مکمل نہ سمجھا جاتا تھا۔ گویا مجھے میری اس بے ادبی کی سزا دی گئی جو میں نے جناب ضیاء کو ایک شکایتی خط لکھ کر کی تھی۔ اب اگر میرے ناظرین اور قارئین مجھے ٹی وی کے مشاعروں میں نہ دیکھ پائیں تو سمجھ لیں کہ یہ کرم جناب ضیاء جالندھری کا ہے جو ایک اصولی مسئلے کو ذاتی سطح پر لے آئے ہیں اور شاعر ہوتے ہوئے بھی اپنے ہمعصر شعراء کے جائز حقوق انہیں دینے کو تیار نہیں۔ مثال کے طور پر ٹی وی ایوارڈز سب کو دیئے جاتے ہیں لیکن اس شاعر افسر نے اپنے شاعروں کو اس ایوارڈ سے ہمیشہ محروم رکھا ہے اور گذشتہ چھ برس کی رائلٹی شاعروں کو ادا کرنے کو تیار نہیں۔ ہمیں ان زیادتیوں کا بہر حال سدباب کرنا ہے ہمیں اپنے حقوق کے لئے لڑنا ہے۔ چاہے اب یہ معاملات عدالت تک کیوں نہ لے جانے پڑیں۔ ہمیں ثابت کرنا ہے کہ ٹیلیویژن کارپوریشن کسی کی ذاتی ملکیت نہیں کہ وہ اس کو انتقامی کارروائیوں کی آگ میں جھونک دے"۔

جناب قتیل نے جناب ضیاء پر پہلا الزام یہ لگایا ہے کہ وہ

ٹی وی کو اپنی تشہیر کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ہماری دیانتدارانہ رائے میں یہ الزام بالکل غلط ہے اگر جناب ضیاء کے ایک دو نغمے ان کے نام سے ٹیلی کاسٹ ہو گئے تو اس سے ان کی شہرت یا نیکنامی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا بلکہ الٹا نقصان پہنچا۔ اسی لئے جناب ضیا نے بجا طور پر اپنی بے بسی اور بے چارگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ان کا کلام ان کی مرضی کے خلاف ٹیلی کاسٹ کیا جا رہا ہے اس سے ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ جہاں ٹی وی کے بے شمار پروگرام عوام کی مرضی کے خلاف ٹیلی کاسٹ ہوتے ہیں۔ وہاں ایک آدھ چیز مینجنگ ڈائریکٹر کی مرضی کے خلاف بھی ٹیلی کاسٹ ہو جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ٹی وی میں آنے کے بعد ضیا صاحب کی بے بسی اور بے چارگی بڑھ گئی ہے، وہ جب وہ ڈاک خانے کے محکمے میں تھے تو اتنے بے بس اور لاچار ہرگز نہ تھے، ان کے تمام شعری مجموعے ڈاک خانے کی ملازمت کے زمانے میں شائع ہوئے تھے۔ اسی لئے ان کی شاعری میں خطوط نگاری کی شان پائی جاتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بہت سے خطوط بیرنگ بھی ہیں۔

ضیا صاحب پر قتیل صاحب نے دوسرا الزام یہ لگایا ہے کہ وہ اپنے ہم عصر شعراء کے جائز حقوق انھیں دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے جناب ضیاء شاعروں کے جائز حقوق تو بجا ناجائز حقوق کے سلسلے میں بھی خاصے فراخ دل ہیں۔ اسی لئے تو ٹی وی کے مشاعروں میں ایک ہی جیسے چہرے اور ایک ہی جیسے شعر دکھائی اور سنائی دیتے ہیں اگر قتیل شفائی اور اس قسم کے دوسرے شاعروں کے حقوق کا خیال نہ رکھا جاتا تو جناب قتیل یہ دعوے ۔۔۔۔۔۔

نہ کرتے کہ "کوئی بھی مشاعرہ میری شمولیت کے بغیر مکمل نہ سمجھا جاتا تھا" سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا لاہور میں موجود پانچ ہزار سے زائد شعرا میں صرف قتیل شفائی ہی ایسے شاعر ہیں جنھیں ہر مشاعرے میں بلانے کی ضرورت ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اب قتیل شفائی صاحب کو آرام کرنا چاہیئے۔ زندگی بھر مشاعرے پڑھ پڑھ کر آپ تھک گئے ہوں گے۔ اب جو فرصت ملی ہے تو اس سے کچھ فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ یعنی کچھ ایسی شاعری بھی کر ڈالنی چاہیئے جو مشاعروں اور فلموں سے باہر بھی کام آسکے۔

جناب قتیل نے جناب ضیاء پر تیسرا الزام یہ عائد کیا ہے "ٹی وی ایوارڈ سب کو دیئے جا چکے ہیں لیکن ایک شاعر افسر نے اپنے شاعروں کو اس ایوارڈ سے ہمیشہ محروم رکھا" جہاں تک ہمیں معلوم ہے ٹی وی ایوارڈ صرف ان فن کاروں اور اہل قلم کو ملتا ہے جنہوں نے ٹی وی کے پروگراموں میں حصہ لیا ہو یا ٹی وی کے لئے بطور خاص کچھ لکھا ہو۔ شعرا حضرات تو بطور خاص اپنے لئے بھی کچھ نہیں لکھتے تو ٹی وی کے لئے کیا لکھیں گے۔ ٹی وی سے ان کا جو کلام ٹیلی کاسٹ ہوتا ہے، وہ ٹی وی کے ایجاد ہونے سے بھی پہلے کا ہے ایسے کلام پر ایوارڈ دینا عجیب سی بات ہے اور پھر ایوارڈ تو ایک اعزاز ہے کوئی جرمانہ تو نہیں جس سے شعرائے کرام کو نوازا جائے۔ ہاں جب کبھی ٹی وی نے اپنے پروگراموں کی نامقبولیت کی بنا پر جرمانے عائد کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو امید ہے شعرائے کرام سرفہرست ہوں گے لیکن ان میں وہ شاعر شامل نہیں ہوگا جس کا کلام دھڑا دھڑ ریکارڈ کیے جانے کی جناب قتیل کو شکایت ہے کیونکہ تمام انتظامات اسی شاعر کے ہاتھ میں ہوں گے۔

جناب قتیل نے اپنے حقوق کے لئے عدالت تک جانے کی دھمکی دی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ عدالت سے پہلے تھانے جانا چاہئے کیونکہ معاملہ قابلِ دخل اندازیٔ پولیس ہے۔ اگر موصوف ۔۔۔۔۔ کی شکایت کا ازالہ پولیس نہ کر سکے تو پھر عدالت کا دروازہ ضرور کھٹکھٹانا چاہئے اور اگر ہو سکے تو اقوام متحدہ میں بھی اس مسئلے کو اٹھانا چاہیئے کیونکہ تیسری دنیا کے بہت سے ملکوں میں ٹی وی والے شاعروں سے اسی قسم کا سلوک کر رہے ہیں۔

جناب قتیل نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "ٹیلی ویژن کارپوریشن کسی کی ذاتی ملکیت نہیں کہ وہ اس کو انتقامی کارروائیوں کی آگ میں جھونک دے"۔ اطلاعاً عرض ہے کہ اگر یہ کارپوریشن کسی کی ذاتی ملکیت ہوتی تو بہتر حالت میں ہوتی چونکہ یہ ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ اسی لئے اس کا حال پتلا ہے۔ بہرحال ہماری دعا ہے کہ حال مزید پتلا ہونے سے پہلے جناب قتیل شفائی کی شکایت دور کر دی جائے اس کی ایک ہی صورت ہے کہ انھیں ٹی وی کے ہر مشاعرے میں بلایا جائے اور اگر ممکن ہو تو کبھی کبھار حال چال پوچھنے کے لئے بھی بلا لیا جائے۔ اس طرح آپس میں تعلقات بہتر ہوتے ہیں۔

معرکۂ قتیل و ضیاء کے بارے میں ہمارے محترم بزرگ جناب احمد ندیم قاسمی نے بھی ایک دلچسپ کالم لکھا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں "ہم قتیل صاحب کے علاوہ ضیاء صاحب کو بھی قریب سے جانتے ہیں۔ دونوں ہمارے عزیز دوست ہیں اور ہمیں دونوں کی نئی تخلیقات عزیز ہیں چنانچہ یہ قطعی طور پر غیر قدرتی صورت حالات لگتی ہے کہ ان دو بڑے شعرا کے درمیان کشیدگی پیدا ہو جائے۔ ہم یہ شبہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ جس طرح حضرت ضیاء جالندھری کے ارشادوں کے مطابق ان کا کلام ان کی مرضی کے خلاف ٹیلی کاسٹ ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح لاہور ٹی وی سینٹر کے مشاعروں میں سے قتیل شفائی صاحب کا اخراج بھی ضیاء صاحب کی بے خبری میں اور ان کی مرضی کے خلاف ہوا ہوگا۔ بہرحال حقیقت کچھ بھی ہو، دونوں اچھے شاعروں کے درمیان اس کشیدگی کو جتنی جلد ہو، ختم ہو جانا چاہیئے۔ ضیا صاحب کو باقاعدہ اعلان کرنا چاہیئے کہ قتیل صاحب کے ساتھ یہ سلوک آئندہ کسی صورت میں روا نہیں رکھا جائے گا اور اب تک جو کچھ ہوا ہے وہ ان کے ایما پر نہیں ہوا ہے اگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا تو مزید خرابی پیدا ہونے کا احتمال ہے اور اس صورت میں ٹی وی اور شاعری کی بے آبروئی کے سوا کیا حاصل ہوگا"۔

جناب احمد ندیم قاسمی نے قتیل و ضیا کو بڑا شاعر ہونے کی سند فرداً فرداً عطا کی ہے۔ اس اعزاز پر ہم ان دونوں کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور میر و غالب سے معذرت کرتے ہیں کہ ہم اب تک آپ دونوں کو بڑے شاعروں میں شمار کرتے تھے۔ اب اصل حقیقت معلوم ہو گئی ہے۔ اس لئے آئندہ یہ غلطی نہ ہوگی۔

جناب قاسمی نے بڑے شعرا کے درمیان کشیدگی کو ناپسند کیا ہے لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہر دور میں بڑے شعراء ایک دوسرے سے کشیدہ رہے ہیں۔ دور کیوں جایئے۔ فیض اور ندیم کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

جناب قاسمی نے ٹی وی اور شاعری دونوں کو بے آبرو ہونے سے بچانے کی خواہش ظاہر فرمائی ہے یہ ویسی ہی بات ہے جیسے کسی مریض کے انتقال کے بعد اس کی صحت یابی کی دعا کی جائے۔

"تنقید اور جھاڑ پھونک کے عمل میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جھاڑ پھونک کے ذریعے سحر و افسوں کے اثر کو زائل کیا جاتا ہے اور تنقید کے ذریعے سحر و افسوں کے اثرات پیدا کئے جاتے ہیں۔ ایک فرق یہ بھی ہے کہ جس پر تنقید کا جادو چل جائے اس پر جھاڑ پھونک کا اثر نہیں ہوتا۔ تنقید کا عمل دو طرفہ ہوتا ہے۔ نقاد یہ سمجھتا ہے کہ اگر وہ رہنمائی نہ کرے تو ادب ترقی نہیں کر سکتا۔ اسی لئے وہ بڑی فراخ دلی سے اسناد تقسیم کرتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ ممولے اور شہباز کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ جن کے نام اسناد جاری کی جاتی ہیں وہ اپنے آپ کو بہت خوش نصیب سمجھتے ہیں اور یہ خوش نصیبی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ ادب تخلیق کرنے کا کام پس منظر میں چلا جاتا ہے اور سند حاصل کرنے کو ادبی بقا کی ضمانت سمجھا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ نقاد، ادبی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں کیونکہ ہم نے بہت سے ایسے ادیب بھی دیکھے ہیں جو خود ہی اپنی ترقی کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ اگر یہ لوگ کوئی معزز اور مفید پیشہ اختیار کر لیں تو اس میں ان کا بھی بھلا ہے اور ادب کا بھی۔

اوپر کا پیراگراف ہمارے اس تنقیدی مقالے کا تمہیدی حصہ ہے جو ہم نے نظیر صدیقی کی نئی کتاب "تفہیم و تعبیر" کی اشاعت سے پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ ارادہ تھا کہ ادھر کتاب شائع ہوگی اور ادھر ہمارا مقالہ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے مقالے کی تکمیل سے پہلے ہی نظیر صدیقی کی کتاب شائع ہو گئی۔ لہٰذا کتاب کو پڑھنے کی ذمہ داری بھی ہم پر آ پڑی۔ ظاہر ہے کہ یہ کام کتاب لکھنے سے زیادہ مشکل ہے لیکن ہماری مشکل یوں آسان ہو گئی کہ کتاب میں شامل تمام مقالے مختلف جرائد میں ہماری نظر سے گزر چکے ہیں۔ لہٰذا انھیں دوبارہ پڑھنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ ہمیں معلوم تھا کہ اگلے صفحے میں نقاد کیا کہے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ آخر تک معلوم نہ ہو سکا کہ وہ پچھلے صفحوں کیا کہہ گیا ہے۔ ہمارے لئے اس کتاب میں نئی چیز اس کا دیباچہ ہے جو "گزارشِ احوالِ واقعی" کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ یہ گزارشِ احوال تو ہے لیکن اس کے "واقعی" ہونے میں شبہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نظیر صدیقی نے ہمارا نام لئے بغیر ہمارے ایک اعتراض کا جواب دیا ہے۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ ہم نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ نظیر صدیقی نے پروین شاکر اور محبوب خزاں کی اتنی تعریف کی ہے کہ اب میر و غالب کی تعریف کرنے کے لئے ان کے پاس کچھ نہیں رہا۔ نظیر صدیقی اس کے جواب میں فرماتے ہیں ـــ "میری بعض تحسینی تنقیدوں سے بعض لوگوں کو سخت تکلیف پہنچتی رہی ہے اور وہ غصے میں اس طرح کی باتیں کرتے رہے ہیں کہ پڑھ لیجئے، پروین شاکر اور محبوب خزاں

پر نظیر صدیقی کے مضامین۔ نہ جانے وہ میر و غالب پر لکھیں گے تو کیا لکھیں گے۔ ایسے قارئین سے میری گزارش صرف اتنی ہے کہ میں میر و غالب پر بھی مضامین لکھ چکا ہوں۔ مگر ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ پروین شاکر اور محبوب خزاں کے بعد میں میر و غالب پر کیا لکھوں گا تو وہ میرے مضامین پڑھ کر خود دیکھ لیں کہ میر و غالب سے متعلق میرے مضامین پروین شاکر اور محبوب خزاں سے متعلق مضامین سے کتنے مختلف ہیں۔"

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں نظیر صدیقی کی تحسینی تنقید سے کبھی تکلیف نہیں پہنچی بلکہ ہمیشہ خوشی ہوئی کہ اگر تحسین و تنقید کا یہی معیار اور یہی رفتار رہی تو ایک دن نظیر صدیقی ہمیں بھی تحسینی تنقید یا تنقیدی...... تحسین سے سرفراز کریں گے۔ آخر ہم نے جو اتنے کالم لکھے ہیں۔ تو کیا ان کی اتنی بھی پذیرائی نہیں ہوگی جتنی محبوب خزاں کی شاعری کی۔ — دوسری بات یہ ہے کہ ہمیں نظیر صدیقی کی کسی بات پر کبھی غصہ نہیں آیا۔ ہم نے ہمیشہ ان کی تحریروں کو ہمدردی کی نظر سے دیکھا ہے۔ اس ہمدردی کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ ہمیں اُن ادیبوں سے بھی ہمدردی ہو جاتی

اُن کے حصے میں آئے ہیں۔ اس پر ہم صرف اتنا اضافہ کریں گے نقصانات کا ایک حصہ بطور قاری ہم تک بھی پہنچتا رہا ہے۔

نظیر صدیقی نے ایک نہایت فکر انگیز بات کہی ہے کہ "تنقید نگاری ایک رئیسانہ شغل ہے"۔ ہمارا خیال تھا کہ اس کے بعد وہ اپنے رئیس ہونے کی تفصیلات بیان فرمائیں گے لیکن اُنہوں نے بڑے روح فرسا حالات کا ذکر کیا ہے فرماتے ہیں:- "اگرچہ ہر وسیع المطالعہ آدمی نقاد نہیں ہو سکتا، لیکن نقاد کو وسیع المطالعہ ضرور ہونا چاہیئے۔ اس کے پاس اتنی استطاعت ہو کہ وہ اپنے پسندیدہ موضوعات سے متعلق دنیا کی بہترین اور تازہ ترین کتابیں خرید سکے اور اس کے پاس اتنی فرصت و فراغت ہو کہ وہ ان کتابوں کو نہ صرف ایک مرتبہ پڑھ سکے۔ بلکہ ان میں بار بار غوطہ زنی کر سکے۔۔ ... میری تنقیدی کوششیں اس معیار پر پوری نہیں اُترتیں۔ میرے بیشتر مضامین بھاگ دوڑ کے عالم میں لکھے گئے۔ اُنہیں لکھنے کے دوران اکثر اوقات ذہنی کوفت اور جذباتی کرب کا سامنا بھی رہا ہے۔ شروع شروع میں ہر مضمون کو ایک مرتبہ لکھ کر اُس کی صاف نقلیں تیار

ٹی ایس ایلیٹ نے کہا کہ شیکسپیئر جیسے عظیم فن کار کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم اُس کے متعلق نئی غلطیاں کرتے چلے جائیں کیونکہ

نقاد کے لئے

وسعتِ مطالعہ

کی شرط عجیب

سی بات ہے

یہ بات یقینی ہے کہ کسی غلطی کو دور کرنے کی سب سے مؤثر صورت یہ ہے کہ کوئی نئی غلطی کی جائے۔ اس قول پر حق کو نقل کرنے کے بعد نظیر صدیقی فرماتے ہیں۔

٭ تنقید یا جھاڑ پھونک کا عمل۔

٭ نقاد کے پاس نظر نہ ہو لیکن نقطۂ نظر ضرور ہونا چاہیئے۔

٭ نظیر صدیقی کی نئی کتاب ——— تفہیم و تعبیر

ہے جن پر نظیر صدیقی تحسینی تنقید کے پھول نچھاور کرتے ہیں تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ ہمیں نظیر صدیقی کی اس بات سے اتفاق ہے کہ میر و غالب سے متعلق اُن کے مضامین پروین شاکر اور محبوب خزاں سے متعلق مضامین سے بہت مختلف ہیں۔ ہماری گزارش صرف اتنی ہے کہ جب آپ نے پروین اور خزاں پر لکھ کر شوق کو پورا کر لیا تو پھر میر و غالب پر لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ ان دونوں پر تو ہر شخص آسانی سے مضمون لکھ سکتا ہے۔

نظیر صدیقی نے "تفہیم و تعبیر" کے دیباچے میں یہ شکایت کی ہے۔ "بعض اُصولوں پر مصر ہونے کے باعث رسالوں سے میرے تعلقات ہمیشہ محدود رہے ہیں اور اب تقریباً مفقود ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس صورت حال کی ذمہ داری جس پر بھی ہو۔ اس کے نقصانات میرے ہی حصے میں آئے ہیں"۔ یہ صورت حال واقعی بہت افسوسناک ہے۔ ہمیں نظیر صدیقی سے دلی ہمدردی ہے۔ البتہ یہ بات وضاحت طلب ہے کہ اُصولوں پر مصر کون ہوتا ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے صدیقی صاحب مرنجاں مرنج آدمی ہیں کسی بات پر اصرار کرنا اُن کی عادت اور مزاج میں داخل نہیں۔ رہ گئے رسالے تو اُن کا اُصولوں سے کیا تعلق؟ رسالے اُصولوں سے نہیں، خریداروں اور اشتہاروں سے چلتے ہیں۔ نظیر صدیقی کا یہ کہنا درست ہے کہ گذشتہ

کرتے وقت اُس میں بہت سی کانٹ چھانٹ کیا کرتا تھا۔ لیکن گزشتہ دس بارہ سال کے دوران میں نے بہت سے طویل مضامین بھی اس طرح لکھے کہ جو کچھ ایک مرتبہ لکھا اسی کو رسالے کی نذر کر دیا۔ میرے پاس نہ اتنی فرصت تھی نہ سکت کہ اُسے دوبارہ لکھ کر اُس کی خامیاں دور کر سکتا۔ میرے مضامین میں یقیناً طرح طرح کی خامیاں ہیں یا ہوں گی۔"

ایک طرف تو یہ کہنا کہ وسیع المطالعہ آدمی نقاد نہیں ہو سکتا اور دوسری طرف نقاد کے لیے وسعت مطالعہ کی قید لگا دینا عجیب سی بات ہے۔ ہمارا خیال ہے بلکہ مشاہدہ یہ ہے کہ نقاد کا بنیادی کام خود مطالعہ کرنا نہیں، دوسروں میں مطالعے کی عادت پیدا کرنا ہے۔ اگر وہ اس مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے تو کتابیں خرید کر پڑھنا کیا، مفت ملی ہوئی کتابوں کو بھی پڑھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

نظیر صدیقی نے اس پر اظہار افسوس کیا ہے کہ اب اپنے مضامین میں کانٹ چھانٹ کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں تنقید کوئی تخلیقی ادب نہیں ہے کہ آدمی ہر وقت کانٹ چھانٹ میں لگا رہے یہ تو پتھر کی لکیر ہے۔ جو کچھ ایک مرتبہ لکھ دیا۔ وہی حرف آخر ہے۔ نظیر صدیقی کو چاہیے کہ وہ صرف لکھنے سے کام رکھیں، وقت خود کانٹ چھانٹ کرے گا۔

"اگر شعر و ادب کے بارے میں میرے اندازے، میرے فیصلے اور میری رائیں غلط بھی ہیں تو میری غلطیاں صحیح رایوں تک پہنچنے کا کوئی صاف راستہ ضرور بتا رہی ہیں"۔ نظیر صدیقی نے ضرورت سے زیادہ انکسار سے کام لیا ہے اردو کے کسی نقاد کے اندازے، فیصلے اور رائیں کبھی غلط نہیں ہو سکتیں۔ وہ جو کچھ لکھتا ہے، اپنی دانست میں درست لکھتا ہے یہ الگ بات ہے کہ اس درست نویسی کے ذریعے غلط نتائج تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے

بعض لوگ نظیر صدیقی پر الزام لگاتے ہیں کہ اُن کے مضامین ضرورت سے زیادہ طویل ہوتے ہیں۔ مثالیں اور حوالے اس کثرت سے دیئے جاتے ہیں کہ اگر انہیں نکال دیا جائے تو مضمون میں صرف عنوان باقی رہ جاتا ہے۔ نظیر صدیقی نے زیر بحث کتاب کے دیباچے میں اس الزام کی بھی تردید کی ہے۔ حالانکہ تردید کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ آج ہمارے درمیان بہت سے ایسے نقاد موجود ہیں جن کے مضامین سے حشو و زوائد چھانٹ دیئے جائیں تو عنوان بھی باقی نہیں بچتا۔

نظیر صدیقی نے یہ بات بھی کہی ہے کہ نقاد کے پاس اپنا کوئی نقطۂ نظر ضرور ہونا چاہیے۔ اچھا ہوا کہ اُنہوں نے نقطۂ نظر کی شرط سے پہلے یہ شرط نہیں لگائی کہ نقاد کے پاس

دوسری قسط

راوی شاہنواز

فلمی دُنیا کی کہانی

ایس مکرجی نے مجھ سے پوچھا۔ آپ کون کون سی فلموں میں کام کر چکے ہیں۔ میں نے جواب دیا صاحب کئی فلموں میں کام کر چکا ہوں۔ انہوں نے پوچھا۔ سوشل فلموں میں کام کیا ہے۔ میں نے کہا۔ بالکل نہیں۔ کیونکہ جن سوشل فلموں میں ہم کام کر چکے تھے مثلاً 'دولت' وغیرہ نام کی سوشل تھیں۔ کام ان میں بھی ڈنڈے چلانے والا تھا۔ اس لئے میں نے انہیں کہا۔ صاحب انڈے والی۔ بطخ والی۔ مرغی والی۔ بندوق والی۔ چشمے والی۔ پستول والی۔ اس قسم کی پکچریں تھیں۔ انہیں سوشل کیسے کہیں۔ پھر ایس مکرجی نے پوچھا سوبر قسم کا کوئی کام کیا ہے؟ "سوبر تو سبھی تھے"۔ پھر پوچھا کوئی لائٹ قسم کا رول آپ نے کیا۔ میں نے کہا لائٹ اور پولائٹ قسم کا کوئی رول نہیں کیا۔ ویسے کچھ سناٹش رول ضرور کئے ہیں لیکن وہ آپ کے مطلب کے نہیں۔ ایس مکرجی انگلینڈ ریٹرن قسم کا رول چاہتے تھے۔ میں نے کہا میں جانتا ہی نہیں انگلینڈ کیا چیز ہے۔ انہوں نے کہا یہ ضروری نہیں کہ آدمی انگلینڈ جائے اور پھر آئے تب انگلینڈ ریٹرن کا رول کرے۔ میں نے کہا۔ لائٹ کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آرہا۔ کس قسم کا لائٹ آپ چاہتے ہیں۔ ویسے میں نے شروع شروع میں کامیڈی رول کیا ہے۔ انہوں نے پوچھا۔ "کہاں کیا ہے کس فلم میں کیا ہے"؟ میں نے کہا فلم میں نہیں سٹیج پر۔" مکرجی نے حیرت سے پوچھا۔ "سٹیج سے آرہے ہو تم"؟ میں نے کہا سٹیج پہ میں ملازمت نہیں کرتا تھا۔ سکول کے زمانہ میں سٹیج پلے کرتا تھا۔ کہنے لگے کوئی چیز تمہیں یاد ہے۔ میں نے کہا یاد کیا ہے۔ بس اللہ کا نام ہی نام۔ کوئی چیز کسی سے سیکھتے نہیں تھے۔ کسی سے پڑھتے نہیں تھے اور پڑھنا گناہ سمجھتے تھے۔ جو جی میں آیا بکتے تھے۔ اسی طرح معاملہ چل جاتا تھا۔ مکرجی نے کہا۔ ٹھہریئے کوئی آئیڈیا۔ میں نے کہا آئیڈیا کیا۔ آپ کو سڑکوں پر دوا بیچنے والے کا کیریکٹر دکھاتا ہوں۔ ممکن ہے آپ نے کبھی راستے میں کسی کو دانتوں کا منجن، آنکھوں کا سرمہ بیچتے دیکھا ہو تو میں نے بھی وہی بکواس شروع کر دی۔ اسی ٹون میں۔ اس کے بعد میں نے انہیں کہا۔ دیکھئے صاحب، اگر آپ باہر جا کے چپراسی سے یہ کہیں کہ اس حرامزادے کو باہر نکالو تو میں خود ہی چلا جاتا ہوں۔ وہ بولے "نہیں، پلیز، آپ تشریف رکھیئے۔ کیا پئیں گے؟" میں نے کہا پلانا چاہتے ہیں تو چائے پلا دیں۔ وہ دراصل بہت بڑا ڈرائنگ ہال تھا۔ اس میں ان لوگوں نے پارٹیشن لگا کے مختلف آفس بنا لئے تھے وہ کسی کی بہت بڑی کوٹھی تھی بلکہ پیلس تھا۔ وہاں فلم کمپنی بنی تھی۔

چائے کا کہہ کے مکرجی ایک کمرے میں چلے گئے اور کسی سے کہنے لگے ایک عجیب و غریب قسم کا آدمی آیا ہے۔ گھڑی میں تولہ، گھڑی میں ماشہ، کبھی کچھ، کبھی کچھ، میری سمجھ میں نہیں آرہا۔ اتنے میں چائے آگئی تو جن صاحب سے وہ بات کر رہے تھے انہوں نے کہا انہیں بلاؤ تو۔ میں یہ گفتگو سن رہا تھا۔ مجھے وہاں بلایا گیا تو وہ بمبئے ٹاکیز کے رائٹر کیشب کا کمرہ تھا۔ ایم اے آنرز تھے۔ ساتھ حسن صاحب تھے کیشب نے مجھے پوچھا۔ کتنی قسم کی سٹوری آپ کو یاد ہے۔ میں نے کہا مجھے تو وہ بھی یاد نہیں جو تھوڑی دیر پہلے سنایا ہے۔ وہ بھی میں نے اپنی طرف سے سنایا، نہ کبھی لکھا ہے نہ پڑھا ہے۔ جو جی میں آتا ہے بک دیتے ہیں۔ اس بات سے انہیں تعجب ہوا۔ یہ ان کے لئے انوکھی چیز تھی اور ہمارے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ لوگ اس پہ بہت محظوظ ہوئے خاص طور پر کیشب۔ وہ کبھی ہنستا ہی نہیں تھا۔ بڑا سیریس۔ بڑا پڑھا لکھا۔ بڑا ذہین و فطین قسم کا آدمی تھا۔ وہ مسکرایا اور کہا۔ معاف کیجئے گا۔ آپ کام کیا کرتے ہیں۔ میں نے جواب دیا۔ یہی کام کرتا ہوں جو ابھی کر رہا ہوں۔ ایکٹنگ کا کام۔ کہتا ہے آپ کو کبھی دیکھا نہیں۔ میں نے کہا۔ نہ دیکھا نہ کبھی آپ ایسی پکچر دیکھیں گے۔ جب یہ وہ حیران ہوا۔ پوچھنے لگا، وہ آپ سٹیج کی بات کر رہے تھے۔ کچھ یاد ہو تو سنائیے۔ میں نے کہا یاد تو نہیں۔ ویسے آپ کو نمونے دکھاتے ہیں لیکن نمونے کے لئے یہ جگہ موزوں نہیں۔ یہ سن کر وہ گھبرائے۔ میں نے کہا ہال میں چلیئے۔ ہال میں گئے تو وہاں مکمل سکوت تھا۔ ان ہالوں میں پن ڈراپ سائلنس ہوا کرتی تھی۔ صحیح معنوں میں خاموشی۔ نہ کوئی آواز، نہ کوئی شور شرابہ۔ اتنی اچھی فلم کمپنی میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔

میری آواز ہال میں جو گونجی تو سب لوگ اپنے اپنے کمروں سے باہر نکل آئے، کیونکہ اس سے پہلے ایسی صورت حال پیش نہیں آئی تھی۔ ایس مکرجی بہت متاثر ہوا۔ رائٹر سے کہا انہیں ڈائیلاگ دو۔ میں نے ڈائیلاگ لئے ایک نظر دوڑائی اور انہیں واپس کر دیئے انہوں نے کہا یہ رکھ لیجئے۔ یاد کرنے ہیں۔ میں نے کہا۔ یاد ہو گئے۔ وہ حیران ہوئے۔ دراصل چار تو ڈائیلاگ تھے۔ باقی کے کسی مسماۃ کے تھے۔ اور لوگوں کے تھے۔ پھر میں نے وہ ڈائیلاگ سنا دیئے۔

پھر ایس مکرجی پوچھتا ہے۔ آپ پتلون پہنتے ہیں۔ میں نے کہا ہاں پہنتے ہیں کبھی کبھی۔ کہنے لگا۔ آپ کے پاس کوئی سوٹ ہے۔ میں نے کہا۔ ہاں وہ بھی ہے۔ پوچھا پھر سوٹ کیوں نہیں پہنتے۔ حالانکہ آپ کوٹ پہن کے نکلے ہیں۔ میں نے کہا۔ جی اس لباس میں میں اپنے آپ کو پرسکون پاتا ہوں۔ اس لئے پہنتا ہوں۔ یہی پہنتا رہوں گا۔ اس پر وہ گھبرا سے گئے، نہیں نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ بہرکیف انہوں نے کہا کل ٹھیک نو بجے صبح آجائیں۔ رائے بہادر جینی لال ہمارے جنرل مینجر ہیں ان سے آپ کو متعارف کرائیں گے، وہ ہمارے مالک بھی ہیں۔

دوسرے روز میں نے شیو بنایا۔ ہیئر کٹ کرایا۔ گرے پینٹ سکائی ٹائی۔ سپورٹ کوٹ۔ فیلٹ ہیٹ اور پاؤں میں ہیپ شو پہن کر روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچتے پہنچتے بج گئے ساڑھے دس۔ گیٹ پہ پہنچ کر میں چٹ لکھنے لگا تو ایک ایکسٹرا سپلائر آگئے۔ "ارے بھائی تم نے تو ہمیں مرواہی دیا تھا۔ صاحب نے کہا تھا اس شخص کے بغیر آنا مت"۔ میں نے کہا "پھر"۔ اس نے کہا۔ کہہ دینا میں ہی آپ کو لے کر آیا ہوں میری نوکری لگی رہے گی۔ میں نے کہا کہہ دیں گے بھائی۔ اپنا کیا جاتا ہے۔

ہوا یوں کہ مجھے کہا گیا تھا کہ ٹھیک نو بجے پہنچنا۔ مجھے ہو گئی دیر۔ اسی دوران وہاں ہلڑ مچ گیا۔ ایس مکرجی بہت پریشان۔ ایس آئی حسن نے انہیں کہا۔ آپ نے یہ کیوں کہہ دیا تھا۔ پتلون بھی پہنتے ہو کہ نہیں۔ شائد برا منا گیا ہے۔ مکرجی کہنے لگے بھائی بات یہ ہے کہ کیریکٹر ہی کچھ اس قسم کا تھا۔ انہوں نے ٹیلی فون کر کے تمام ایکسٹرا سپلائروں اور پروڈکشن مینجر کو بلایا اور میرا نام بتایا کہ اس شخص کو جانتے ہو۔ ان لوگوں نے کہا ہاں صاحب یہ واڈیا کا ولین ہے۔ مکرجی نے کہا ہر صورت اس آدمی کو تلاش کر کے لاؤ۔ اگر نہیں ملے تو واپس مت آنا۔ میری تلاش میں ناکامی کے بعد وہ لوگ گیٹ کے باہر گول میز کانفرنس کر رہے تھے کہ میں پہنچ گیا۔ بہرکیف، میں اندر گیا تو جیسے ہی ایس مکرجی نے دیکھا۔ حیرانی سے کہا۔

"آپ تو بالکل تبدیل ہو گئے۔ گڈ۔ گڈ۔ گڈ۔ پھر مکرجی نے کہا کیوں نہیں تم اسے پہنتے ہو۔ میں نے کہا۔ پھر آپ نے کہا کیوں نہیں پہنتے ہو۔ اسے تیرے باپ پہنتے تھے تیرے دادا پہنتے تھے۔ میں تو ایسے ہی پہن لیتا ہوں۔ کہنے لگے۔ رائے بہادر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں گیا۔ رائے بہادر نے دیکھا اور کہا ڈائیلاگ سناؤ۔ میں شروع ہو گیا۔ آج کل کے مقابلے میں وہ ڈائیلاگ کچھ نہیں تھے۔ لیکن ان کے لئے ان کی بہت اہمیت تھی۔ ڈائیلاگ سن کے رائے بہادر جینی لال نے نہایت سٹائل سے کہا۔ بیبے ٹاکیز دل انقام لو (ابھی ٹاکیز آپ کو اطلاع کر دے گی) تاہم انھوں نے رائے بہادرانہ انداز میں ڈسپلن اور اچھے طور طریقوں پر زور دیا۔ میں نے انہیں کہا۔ اگر آپ ڈسپلن کے متعلق مجھے کہتے ہیں تو میرا اور میرے باپ کا تعلق فوج سے رہا ہے۔ آدمی سے زیادہ ڈسپلن اور کہیں نہیں۔ یہ سن کر سالا کچھ بولا نہیں۔

اس دوران ایس مکرجی نے کہا آپ ایسا کریں کیمرے کا ٹرائل دے دیں۔ وہ بھی ہو گیا۔ حاصل وہ پکچر کی دوبارہ شوٹنگ کرنا چاہتے تھے۔ پہلے مصرانے یہ رول کیا تھا لیکن وہ انگلینڈ ریٹرن جچا نہیں، اس کی جگہ انھوں نے بہت سوں کو ٹرائی کیا۔ جتنے ٹاپ موسٹ سٹار تھے سبھی ریجیکٹ ہو گئے۔ ایک یہ بھی بات تھی کہ لاؤڈ پکچروں کا زمانہ تھا۔ جن میں لاؤڈ ایکسپریشن چلتے تھے۔ اونچا بولو تو کہتے یہ تو بادشاہ آدمی ہے۔ لیکن یہاں معاملہ گڑبڑ تھا۔

خیر صاحب انھوں نے میرا ٹرائل لیا اور ساؤنڈ انجینئر کو میرے ساتھ کر دیا کہ انھیں ٹیلر کے پاس لے جاؤ۔ جانے لگے تو ایس مکرجی نے پوچھا۔ کیا لینا دینا ہو گا۔ میں نے کہا لینا دینا کیا۔ آپ کے پاس ٹیلیفون ہے۔ پرکاش والوں سے پوچھ لیجئے۔

مکرجی نے جواب دیا۔ نہیں نہیں پھر بھی جو تم بولو گے وہی ہو گا۔ پھر کہتا ہے میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں ٹکو اور یہاں سے فائدہ اٹھاؤ۔ چلو دو سو روپے

دے دیں گے۔ یہ سمجھا کہ یہ تمھارے سگریٹ کا خرچہ ہے۔ میں نے کہا چلو یہی سمجھ لیں گے۔ وہ پکچر مہینہ پندرہ دن میں ختم ہو گئی۔ کیونکہ پکچر تو مکمل تھی۔ میرا کام ہی دوبارہ فلمایا جاتا تھا۔ اس فلم میں اشوک کمار ہیرو۔ لیلا چٹنس ہیروئن۔ بی ایس ڈیسائی کامیڈین تھا۔ ڈیسائی مہاراشٹرا تھا۔

وہاں رواج تھا کہ فلم کے پریمیر شو پر شہر کی اہم شخصیتوں کو بلایا جاتا تھا۔ ٹاپ موسٹ قسم کے رائٹر۔ بڑے بڑے اخبارات کے ایڈیٹر۔ معززین شہر۔ غرض یہ کہ سب اونچے لوگ ہوا کرتے تھے۔ پریمیر شو میں ایک ہنگامہ ہو گیا۔ ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں مبارک مبارک مبارک۔ لوگ گلے مل رہے ہیں۔ کچھ میری سمجھ میں نہ آئے۔ میں ایک دوست کو ساتھ لے گیا تھا وہ سٹنٹ فلموں کا ہیرو تھا۔ کہنے لگا، گورو تم بہت بری طرح جمے ہو۔

اچھا صاحب! دوسرے دن میں پیسے لینے جیسے ہی سٹوڈیوز پہنچا۔ مجھ سے کہا گیا کہ اگلی فلم کے لئے سائن کر دیں۔ میں نے کہا سائن وائن کی بات نہیں پہلے پیسے دو۔ ہوتے ہواتے انھوں نے میری تنخواہ دو سو سے بڑھا کر سوا دو سو کر دی اور ملازمت پرمانٹ کر دی اور فلم 'پنر ملن' کے لئے میرے ساتھ معاہدہ کر لیا۔ ولین کا تیسرا نام آتا تھا ان لوگوں نے میرا نام پانچواں دیا۔ میں نے کہا۔ بھائی کوئی اصول سے چلو یعنی ہیرو ہیروئن کے بعد ولین کا نام لاؤ۔ لیکن تمھارا کیا اصول ہے یہی کہ ولین کا پانچواں نام آرہا ہے۔ آدمی کام کر رہا ہے اس لئے کہ اس کی شہرت ہو۔ انھوں نے گول مول سا جواب دیا اور کہا میرا اصول یہ ہے میرا اصول وہ ہے۔ میں نے کہا۔" گولی مارتا ہوں تمھارے اصول کو۔ میرا اصول یہ ہے کہ میں ریزائن کرتا ہوں"۔ اس

بات پر ہنگامہ ہو گیا۔ میں اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ وہاں اونچی آواز میں بولا جائے تو گونج پیدا ہوتی تھی۔ اس لئے ہنگامہ کا سماں پیدا ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد میں جانے لگا تو مکرجی کو معلوم ہوا تو وہ باہر آیا بولا۔ "مانگتا نہیں تمھارے کو" یعنی مجھے تمھاری ضرورت نہیں ہے۔ میں نے کہا کام کرنا ہی نہیں چاہتا۔ مکرجی نے کچھ دیر سوچا اور کہا۔ آپ ابھی تک میری کمزوری ہیں۔ اس ہنگامہ کا فائدہ یہ ہوا کہ میری تنخواہ مزید ۲۵ روپے بڑھ گئی یعنی ڈھائی سو ہو گئی۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری ورلڈ وار شروع ہو گئی، جب تک میں آٹھ دس پکچروں میں کام کر چکا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے 'بندھن' بننے والی تھی کہ رائے بہادر چونی لال نے کہا، نوجوان اب کیا ہو گا۔ جنگ چھڑ گئی ہے۔ فلم کیسے بنے گی، خرچہ کیسے برداشت ہو گا۔ کیا کریں گے۔ مطلب اس کا یہ تھا کہ سالے کچھ مانگیں نہیں۔ میں نے کہا صاحب جنگ ہوتی رہے۔ ڈرائیونگ لائسنس میرے پاس ہے۔ ہاتھ پاؤں بھی مضبوط ہیں۔ باپ دادا سب فوج میں تھے۔ ہم بھی فوج میں بھرتی ہو جائیں گے۔

'پنر ملن' کے بعد 'نیا سنسار' اور 'جھولا' وغیرہ بنیں۔ پھر 'قسمت' شروع ہوئی ایس مکرجی نے اپنا سٹوڈیوز شروع کر دیا تھا۔ میں نے موقع غنیمت جان کے ان سے باہر کی فلموں میں کام کرنے کی اجازت لے لی۔ ورنہ وہ اجازت دیتے نہیں تھے۔ میں باہر بھی کام کرنے لگ گیا۔ 'قسمت'، اتنی چلی کہ یہاں پی آئی اے میں ایک صاحب انجینیر ہیں انھوں نے مجھے بتایا۔ بھائی میں کلکتہ میں تھا کہ تمھاری پکچر 'قسمت'، لگی تھی اس کے فوراً بعد میں انجینیرنگ کے لئے باہر چلا گیا۔ ساڑھے چار سال بعد واپس آیا تو 'قسمت'، اسی سینما میں ابھی چل رہی تھی۔

"قسمت" میں ہیں تھا۔ ڈیسائی تھا۔ ممتاز شانتی ہیروئن تھی۔ اشوک کمار ہیرو تھا۔

اشوک کا نام آیا ہے تو ساتھ ہی ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا:

اشوک کمار کو کسی نے پشاور دعوت پر بلایا تھا "افغان ہاؤنڈ" بڑا خونخوار کتا ہوتا ہے۔ وہ انھیں تحفتہً دے دیا "مہاراجہ" اشوک کمار نے اس کتے کے لئے ٹرین میں فرسٹ کلاس کا ڈبہ ریزرو کرایا۔ ایک سٹیشن پر ایک پٹھان نے دیکھا تو بولا : "تمھارے پاس یہ کتا کیسے آیا" اشوک نے کہا کہ فلاں نے مجھے دیا ہے۔ پٹھان نے کہا کہ بہت اچھا کتا ہے۔ ہم لوگ یہ کتا کسی کو دیتا ہی نہیں۔ تمھارے کو دے دیا، تمھارا بہت نصیب ہے۔

بمبئی میں فلیٹ تو سبھی ایک قسم کے تھے۔ ایک روز کسی دوسرے فلیٹ کے کام کرنے والی نے غلطی سے اشوک کے فلیٹ کی گھنٹی بجا دی۔ کتے نے دیکھا یہ کون آگئی ہے۔ اس نے جو حملہ کیا تو ساڑھی سمیت اس عورت کی بوٹی اتار لی۔ صاحب وہ طوفان مچا کہ مت پوچھئے۔ اس کے میاں اور خاندان والے سب پہنچ گئے۔ کتے کو مار دھاڑ کیا گیا تو وہ کتا مار کھانے کے بعد آرام سے لیٹ گیا۔ بعد میں اس عورت کے خاوند کو ہزار دو ہزار روپے دیکر معاملہ رفع دفع کرایا گیا۔

پھر ایسا ہوا کہ ریٹ کلکٹر صاحب آگئے اور انھوں نے گھنٹی بجائی۔ کتے نے دیکھا کہ یہ کون گھسا چلا آرہا ہے تو جناب کتے صاحب نے چھلانگ لگائی اور اس کی بوٹیاں نوچ ڈالیں اور پتلون وغیرہ کے چیتھڑے اڑا دیئے۔ بہر کیف ریٹ کلکٹر پر حملے کے بعد وہ شور مچا وہ ہنگامہ ہوا کہ مت پوچھئے۔ پھر ان کو ہزار پانچ سو دے کر معاملہ رفع دفع کرایا گیا۔

پھر ایک دن اشوک کمار کچھ دوستوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ ڈرائنگ ڈائننگ کمبائنڈ ہی تھے۔ کسی یار دوست نے اشوک کو ہاتھ مارا تو کتا صاحب نے بڑے ڈرائننگ ٹیبل کے اوپر سے چھلانگ لگائی اور اس دوست کے سینے پر سوار ہو گیا۔ بڑی مشکل سے اسے اتارا گیا۔

اس زمانے میں اشوک کے نیچے گورے رہتے تھے جنھیں ٹامی کہتے ہیں ان کے پاس آرمی کے کتے ہوتے تھے۔ ایک شام کتا صاحب کو ٹہلانے کے لئے اشوک کا نوکر نکلا۔ دو کتے ساتھ لئے۔ ایک چھوٹا اور دوسرا وہی افغان ہاؤنڈ۔ آرمی والا کافی اونچے قد کا خونخوار کتا مانا جاتا ہے۔ اس نے افغان ہاؤنڈ کو نیچی ذات کا کمزور اور تھرڈ کلاس سمجھ کر غرا کر ڈرانے کی کوشش کی تو افغان ہاؤنڈ نے جھٹکا مار کر نوکر کے ہاتھ سے زنجیر چھڑالی اور جھپٹ کر اس کتے کو پکڑ لیا۔ پکڑنے کے بعد اس کا گلا دبا کر ختم کر دیا۔ ادھر گوروں نے یہ صورت دیکھی تو بندوق لے آئے۔ ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ اس کتے سالے کو ختم کرو۔ اشوک کو معلوم ہوا تو اس نے گوروں کو سمجھا بجھا کر سلام دعا کر کے چپ کرایا۔

میں نے کہا کہ تم یہ کیا مصیبت میں پھنس گئے۔ ہزاروں کی بات ہو رہی - - - - - - - - - -

ہے یار۔ میرے پاس ہوتا تو میں مار ڈالتا سالے کو۔ تم اسے مارتے بھی نہیں ہو اور نہ کسی کو دیتے ہو۔ اشوک نے کہا کہ یار "کسی نے اگر اس کو مار ڈالا تو اس کا پاپ میرے پر ہوگا"۔

دراصل اشوک بہت ہی نرم دل اور صاف ذہن کا آدمی تھا۔ کہنے لگا یہ کتا لے کر میں مصیبت میں پھنس گیا ہوں ہزاروں روپے کا چکر پڑ گیا ہے۔ اس چکر میں اس کے دس ہزار روپے چلے گئے۔ اس دوران اس کو ریاست برودہ کا لینڈ لارڈ ملا۔ اس نے کہا کہ بھائی میری لینڈ ہے وہاں مجھے اس جیسے کتے کی ضرورت ہے۔ اشوک نے اس لینڈ لارڈ کی دعوت کی اور خاطر مدارت کر کے کتا اس کے حوالے کیا اور اس کا شکریہ بھی ادا کیا۔

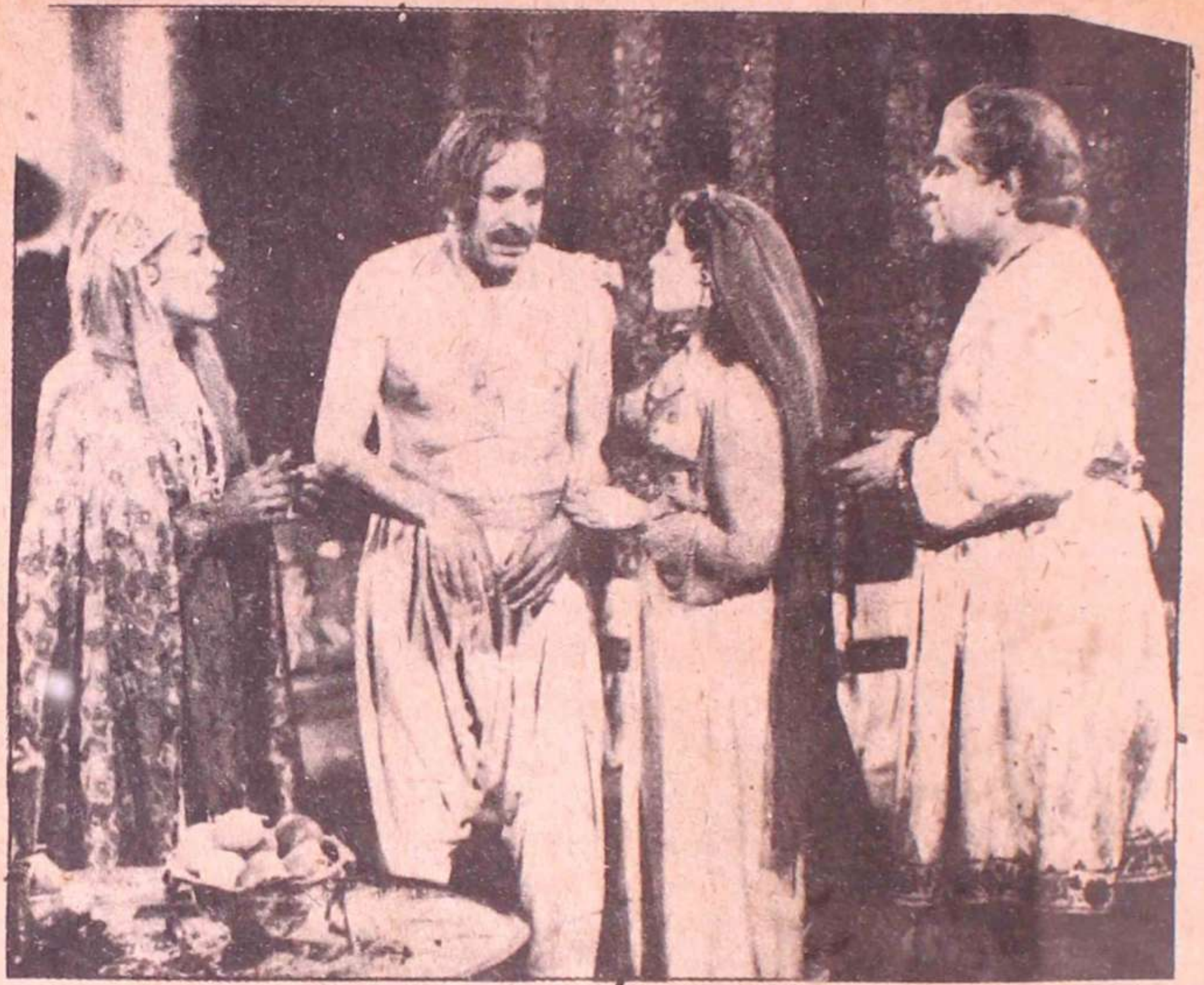

۱۹۵۴ء۔ شاہنواز، صبیحہ، غلام محمد مرحوم اور مایا دیوی۔ "سسی" میں

تو اس طرح کتے سے اشوک کی جان بچی۔

ہاں، تو قسمت، کے بعد اشوک، ڈیسائی اور رائے بہادر چونی لال بمبے ٹاکیز چھوڑ کر فلمستان سٹوڈیوز آ گئے۔ یہ سٹوڈیوز ایس مکرجی کا تھا۔ وہ اشوک کا برادر ان لا تھا۔

مجھے بھی انہوں نے کہا۔ میں نے کہا میں تمہارے سے ہزار روپیہ مہینہ تنخواہ لوں گا۔ اور چھ مہینے کا ایڈوانس۔ تب آؤں گا۔ ورنہ فلمستان کی بجائے قبرستان میں رہوں گا۔ ان سب کو معلوم تھا کہ اس کی دیویکا رانی سے تو تو میں میں ہو چکی ہے۔ نہ یہ خود رہے گا۔ نہ اسے دیویکا رانی رکھے گی، خود ہی آ جائے گا۔ وہ جب فلمستان میں چلے گئے تو میں کسی فلم میں کام کرنے کے لئے چھٹی پہ گیا ہوا تھا۔ واپس آ کر میں بمبے ٹاکیز میں حاضر ہو گیا۔ کیونکہ میرا وہاں ایگریمنٹ ابھی چل رہا تھا۔ وہ لوگ مجھے دیکھ کر بہت گھبرائے کہ یہ ساتھ نہیں گیا۔ کیونکہ ہم لوگوں کا پورا گروپ تھا۔ دیویکا رانی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ایک بات پوچھوں۔ میں نے کہا۔ دو پوچھو۔ اس نے کہا آپ ان لوگوں کے ساتھ گئے نہیں۔ میں نے جواب دیا۔ اگر آپ کہتی ہیں تو چلا جاؤں گا۔ اس نے گھبرا کے کہا، میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ بتاؤ کیا لو گے کیا دو گے۔ میں نے کہا ایک ہزار لوں گا۔ نہیں دو گی تو چلا جاؤں گا۔ تم زبردستی تو مجھے رکھ نہیں سکتیں۔ اس کے علاوہ آنے جانے کا موٹر گاڑی الاؤنس لوں گا۔ یہ الاؤنس دو سو روپے ہوتا تھا۔ تو وہ بولی تمہاری تنخواہ ڈھائی سو ہے۔ تم بڑھا کر ایک ہزار کہہ رہے ہو۔ یہ لمیٹڈ کمپنی ہے۔ ایسا کرو کہ ڈھائی سو سے بڑھا کر پانچ سو کیے دیتے ہیں۔ تمہارا نقصان نہیں ہو گا۔ پیسے تمہارے مریں گے نہیں۔ ایڈجسٹ ہو جایا کریں گے۔ اس طرح بمبے ٹاکیز کے بینر پہ بننے والی فلم میں آخری نامور آدمی میں تھا۔ جو ان کے ساتھ رہ گیا۔

پندرہ دن بعد لیٹر آیا تمہاری تنخواہ ساڑھے سات سو روپے ہو گی۔ پھر پندرہ دن بعد اور بڑھ گئی۔ اس طرح ایک مہینے میں میری تنخواہ ایک ہزار ہو گئی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ڈبل بونس بھی دیں گے۔ شرط یہ تھی کہ تم بمبے ٹاکیز چھوڑ کے جاؤ گے نہیں۔ اس کے بعد انہوں

بقیہ صفحہ ۲۸ سے آگے

نظر بھی ہونی چاہیے۔ یہ حقیقت ہے کہ لکھنے کے لیے نظر سے زیادہ نقطۂ نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ نظر تو پھسل بھی سکتی ہے۔ نقطۂ نظر کبھی نہیں پھسلتا۔

معاف کیجئے ہمارے کالم کا بیشتر حصہ نظیر صدیقی کے دیباچے کی نذر ہو گیا۔ اصل کتاب کے بارے میں ہم نے کچھ کہا ہی نہیں۔ کتاب سے پہلے چند باتیں ——

اگر صاحب کتاب کے بارے میں بھی کر لی جائیں تو کوئی حرج نہیں۔ نظیر صدیقی بڑے زرخیز ذہن کے مالک ہیں۔ وہ بیک وقت شاعر، انشائیہ نگار، طنز و مزاح نویس اور نقاد ہیں۔ لیکن زیادہ شہرت انہیں نقاد کی حیثیت سے حاصل ہوئی ہے اور اس کے وہ مستحق بھی ہیں۔ انہوں نے اردو تنقید کو ایک نیا انداز دیا ہے وہ جس موضوع پر لکھتے ہیں اس کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ اور یہ ضروری نہیں کہ وہ حق نمک ہی ہو کیونکہ انہوں نے بہت سے ایسے ادیبوں اور شاعروں پر بھی مضامین لکھے ہیں جن سے ان کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی یا جو خوش قسمتی سے نظیر صدیقی کی طبع آزمائی سے بہت پہلے انتقال فرما چکے تھے۔

نظیر صدیقی کا مطالعہ وسیع ہے وہ قدیم و جدید ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اور یہ قدیم و جدید ادب صرف اردو زبان کا نہیں، مشرق و مغرب کی کئی زبانوں کا ہے خصوصاً انگریزی ادب کا ان کا مطالعہ قابل رشک ہے انہیں ادب کے ساتھ بعض معاشرتی علوم سے بھی دلچسپی رہی ہے خاص طور پر فلسفے کا انہوں نے وسیع مطالعہ کیا ہے جس سے ان کی تنقید میں گہرائی پیدا ہوئی ہے۔ اگر ہم سے یہ کہا جائے کہ پاکستان میں اردو کے پانچ بڑے نقاد کون ہیں۔ تو ہم ان پانچوں سواروں میں نظیر صدیقی کو ضرور شامل کریں گے۔ خواہ باقی چار نامزد حق ہی کیوں نہ ہو جائیں۔

نظیر صدیقی کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ انہیں اردو لکھنی آتی ہے۔ ان کا اسلوب شاداب اور توانا ہے جو پڑھنے والے کے دل و دماغ دونوں کو متاثر کرتا ہے ورنہ ہمارے نقادوں میں زیادہ تر ایسے ہیں کہ ان کے اسلوب سے خود ان کے اپنے دل و دماغ کے شدید متاثر ہونے کی شہادت ملتی ہے۔

اب آیئے کتاب کی طرف، اس میں ایک درجن مضامین ہیں۔ تین مضمون غالب پر اور دو اقبال کے بارے میں ہیں۔ پانچ مصطفیٰ زیدی، ممتاز مسعود (بحوالہ "آواز دوست")، پروین شاکر۔ جمیل نظہری اور محمد حسن عسکری (بحوالہ "جدیدیت ....") کے متعلق اور باقی دو فرمائشی قسم کے ہیں جو "ادب امن اور جنگ" اور "ثقافت اور اس کے مسائل" کے عنوانات کے تحت ہیں۔ یوں تو اس مجموعے کے سبھی مضامین (بحوالہ بالا آخری دو کو چھوڑ کر) پڑھنے کے لائق ہیں۔ لیکن دو مضامین کا ہم بطور خاص ذکر کریں گے۔ ایک تو "غالب کی فن کاراز ہمہ گیری" ہے جس میں غالب کی شاعری کے بعض پہلوؤں پر مفصل بحث کی گئی ہے اور دوسرا مضمون "اقبال۔ ایک شاعر" ہے جو بظاہر سلیم احمد کی اسی نام کی کتاب پر تبصرہ ہے لیکن دراصل اقبال کی شاعری کا ایک فکر انگیز تجزیہ ہے۔

کالم تمام ہوا جا رہا ہے اور سرح باقی ہے۔ بہر حال پروین شاکر والے مضمون کا ذکر کئے بغیر ہم کالم ختم نہیں کر سکتے۔ یہ مضمون ہم نے پہلے بھی پڑھا تھا اور اب دوبارہ پڑھا ہے پہلے ہمارا خیال تھا کہ نظیر صدیقی نے ضرورت سے زیادہ تفصیل سے کام لیا ہے لیکن اب ہمارا خیال یہ ہے کہ اس مضمون میں تو صرف اشارے ہیں جو ۳۶ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں کیا ہی اچھا ہو اگر نظیر صدیقی ۱۹۷۸ء (جب یہ مضمون لکھا گیا تھا) کے بعد کی پروین شاکر کی شاعری کو سامنے رکھ کر اس مضمون کو دوبارہ لکھیں اور جہاں جہاں انہوں نے اجمال سے کام لیا ہے۔ وہاں تفصیل سے بحث کریں۔ مثلاً ایک جگہ پروین کی شاعری کی خصوصیات گنواتے ہوئے وہ لکھتے ہیں "پروین شاکر کی ایک اور فنی خصوصیت توسین کا استعمال ہے۔۔۔۔ پروین اردو کی پہلی شاعر یا شاعرہ ہیں جنہوں نے توسین کو جا بجا اپنی نظموں میں استعمال کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ کہیں کہیں ان کا استعمال خوبصورت اور دلچسپ ہے۔"

نظیر صدیقی نے صرف توسین پر گفتگو کی ہے۔ حالانکہ پروین کی شاعری میں کومے، ڈیش، فل اسٹاپ، سوالیہ نشان اور دیگر رموز و اوقاف کا استعمال بھی بڑی خوبصورتی سے کیا گیا ہے کیا ہی اچھا ہو اگر نظیر صدیقی اس پہلو پر مفصل بحث کریں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ پروین شاکر رموز اوقاف کے استعمال میں دنیا کے کسی بھی بڑے سے بڑے شاعر کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔

"تفہیم و تعبیر" کاروان ادب ملتان صدر سے شائع ہوئی ہے۔ اس کی قیمت صرف تیس روپے ہے لیکن ہمیں تبصرے کے لئے مفت ملی تھی۔ اس لئے ہم سے آدھی قیمت پر خریدی جا سکتی ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ خریدی ہوئی چیز واپس نہیں لی جائے گی۔

مشہور مزاح نگار فکر تونسوی ترتیب دے رہے ہیں

کالم نگار نمبر

چنگاری کا خصوصی شمارہ

یہ ایک دستاویزی اہمیت کا حامل نمبر ہوگا

ماہنامہ سہیل گیا کی فخریہ پیش کش

کیفی اعظمی نمبر

ہندوستان کے چوٹی کے فن کاروں کے ذریعہ ترقی پسند شاعر کیفی اعظمی کے فکر و فن، شاعرانہ عظمت اور ادبی مقام و مرتبے کا تعین —— کیفی اعظمی کی نمائندہ نظموں اور غزلوں کا انتخاب اعلیٰ اور نفیس کتابت و طباعت کے ساتھ فروری ۸۳ء میں منظر عام پر آ رہا ہے۔

دیوانِ غالب
مرتبہ —— مالک رام
قیمت —— ۱۲/۵۰ روپے

خاندانِ لوہارو کے شعرا
مرتبہ —— حمیدہ سلطان احمد
قیمت —— ۳۰ روپے

مقالات بین الاقوامی غالب سمینار (اردو) ۱۹۶۹ء
مرتبہ —— ڈاکٹر یوسف حسین خاں
قیمت —— ۳۰ روپے

مقالات بین الاقوامی غالب سمینار (انگریزی) ۱۹۶۹ء
مرتبہ —— ڈاکٹر یوسف حسین خاں
قیمت —— ۱۰ روپے

غزلیات غالب (اردو) انگریزی ترجمہ

طنز و مزاح

معین اعجاز

من کہ قبلۂ اردو

ادب نواز دوستو اور زبانِ اردو کے شیدائیو! سچ کہتا ہوں "قبلۂ اردو" کی حیثیت سے آج چاردانگِ عالم میں میرے نام کا شہرہ ہے۔ پہلے تو میں یہ بتادوں کہ یہ منصبِ جلیلہ اتنی آسانی سے نہیں مل گیا۔ میں نے برسوں گڑے مردوں کی تجارت کی اور تب کہیں جاکر ایک عظیم المرتبت اور مستند محقق بنا۔ مردوں کے اس کاروبار میں مجھے کچھ اتنا فائدہ ہوا کہ اس کے سہارے میں نے کچھ دوسرے کاروبار بھی شروع کردیئے جن مردوں کی میں نے تجارت کی اُن میں ایک بڑا ہی برگزیدہ اور محترم مردہ تھا جس کی بدولت میں نے اس کاروبار میں

اپنی شناخت قائم کی اور آج آپ کی دعا اور خدا کے فضل سے ایک عالیشان کوٹھی، خوبصورت چمچماتی کار، پرکشش بینک بیلنس اور آرام و آسائش کے جملہ سامان کا بلا شرکت غیرے مالک

عالیشان کوٹھی، خوبصورت چمچماتی کار، پرکشش بینک بیلنس اور آرام و آسائش کے جملہ سامان کا بلا شرکتِ غیرے مالک و مختار ہوں۔ آج میرے پاس درجنوں خوبصورت اور قیمتی شیروانیاں ہیں حالانکہ تین دہائی قبل میں ایک عدد اوسط درجے کی شیروانی کے لیے بھی ترستا تھا۔ یہ سب کچھ اسی نیم مردہ زبان کی دین ہے جسے

ہم اور آپ اردو کہتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ کسی زمانے میں نواب مرزا خان داغ دہلوی نے فرمایا تھا:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

لیکن حضرتِ داغ نے کسی اور سیاق وسباق میں یہ بات کہی ہوگی اب تو یہ دعویٰ میں اور صرف میں کرسکتا ہوں کیونکہ میرے بغیر آج اردو کی کوئی بھی کمیٹی یا اکیڈمی نہیں قائم ہوسکتی۔ داغ نے اس زبان کو بہت کچھ دیا ہوگا لیکن میں نے تو اس کے نیم مردہ جسم سے بھی لہو نچوڑ لیا اور نیپولین بونا پارٹ کا یہ قول سچ ثابت کردکھایا کہ دنیا میں کوئی کام ناممکن نہیں ہوسکتا۔

اگر آپ اردو کے باہوش ادیب یا قاری ہیں اور آپ کی یادداشت آپ کو دھوکہ نہیں دیتی تو یاد کیجیے۔ آج سے کوئی پچیس تیس سال قبل اردو کے مشہور طنز نگار آنجہانی کنہیا لال کپور نے کہا تھا کہ اردو کا حال اس مقتول جیسا ہے جس کا پوسٹ مارٹم کرنے کے بعد لاش کو لواحقین کے حوالے کر دیا گیا لیکن قاتل کو البتہ باعزت بری کر دیا گیا ہے۔ یہ بیان پڑھ کر میں چونکا لیکن پھر ایک ہلکی سی مسکراہٹ میرے لبوں پر نمودار ہوئی۔ دراصل کپور صاحب سیدھے سادے اور شریف قسم کے انسان تھے۔ انھوں نے جذبات کی رو میں یہ بات کہہ دی ہو گی اس لیے مجھے ان کا خیال کچھ مشکوک سا لگا۔ بہر حال میں نے ٹوپی سنبھالی اور چھان بین میں مصروف ہو گیا کہ مردوں سے تو مجھے یوں بھی دلچسپی رہی ہے بھلے ہی ان کی زندگی میں نہ رہی ہو) بڑی تلاش وجستجو کے بعد ایک مستند ڈاکٹر سے یہ معلوم ہوا کہ اردو کے پوسٹ کا تو سوال ہی نہیں کیونکہ ابھی اسے مردہ نہیں ڈکلیر کیا گیا ہے میں بھی جانتا تھا کہ یہ کم بخت بڑی سخت جان ہے اور اتنی آسانی سے نہیں مر سکتی۔ لہٰذا میں نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کیا کہ اگر اب تک نہیں مری ہے تو کسی صورت سے اسے مار دیا جائے اور پھر بھی نہ مرے تو اسکی بیماری سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے اور چنانچہ اس فیصلے کے مطابق میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اسے مارنے میں تو میں بیشک ناکام رہا لیکن اس کی بیماری اور خانہ خرابی سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ اردو اور اردو والوں کی بے چارگی اور اپنی چالاکی کا کچھ حال آپ کو سناؤں تو سنئے اردو کے عزیزو اقارب رو پیٹ کر بیٹھ چکے تھے اور کچھ فاتحہ خوانی کر رہے تھے لیکن کچھ "ستم گر" ایسے بھی تھے جو اس کے "مرنے پر بھی راضی" نہ ہوئے میں نے ان کے جذبات سے کھیلنا شروع کیا اور جگہ جگہ مجمع اکٹھا کر کے لوگوں کو یہ باور کرایا کہ "اے لوگو! دیکھو تمھاری اردو ایک انتہائی مہلک بیماری میں مبتلا ہے۔ اور اس کے علاج کے لیے کوئی تیار نہیں یہاں تک کہ خیراتی ہسپتال میں بھی اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں پیدا کی جا رہی ہے۔" میں نے ان لوگوں سے یہ بھی کہا کہ "تم مجھے پیسے دو میں تمھیں اردو دلوا دوں گا" ٹھیک اس طرح جس طرح نیتا جی نے کہا تھا "تم مجھے خون دو میں تمھیں آزادی دلواؤں گا۔" میری اس اپیل کا بڑا اثر ہوا اور لوگوں نے تن من دھن سے میرا ساتھ دیا۔ جہاں تک ان کے تن اور من کا سوال ہے اس سے مجھے سروکار نہیں تھا لیکن ان کے دھن سے ضرور دلچسپی تھی میری اس تحریک سے یہ فائدہ بھی ہوا کہ مخالف کیمپ میں کھلبلی مچ گئی اور وہ دہائی دیتے ہوئے میرے پاس آئے میں نے ان سے بھی معاملات طے کر لیے اور اس طرح میری قسمت کا ستارہ چمکنے لگا۔ اب دونوں طرف میری آؤ بھگت ہونے لگی۔ ایک جانب سے انعام و اکرام ملنے لگے اور دوسری جانب سے داد و تحسین اور فلک شگاف نعرے! ان تمام کارروائیوں کے درمیان میرا بنیادی کاروبار یعنی مردہ فروشی کا کام بھی حسب معمول چلتا رہا۔ اور ترقی کرتا رہا۔ اس میدان میں کوئی بھی اس "مرد افگنِ عشق" کا "حریف" نہ پیدا ہو سکا۔ حالانکہ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ میں نے اس تجارت میں خوب خوب گھپلے کیے ہیں اکثر ایسا بھی ہوا کہ دوسروں کے مال پر اپنے نام کی مہر لگا دی۔ میرے دوسرے ہم پیشہ بھی اس راز سے واقف ہیں لیکن کیا مجال کہ وہ میرے خلاف زبان کھول دیں کہ انھیں بھی اپنی عاقبت عزیز ہے وہ جانتے ہیں کہ آج نہیں تو کل انھیں بھی کہیں نہ کہیں سے انعام لینا ہے اور یہ کارِ خیر میرے تعاون یا اشارے کے بغیر انجام نہیں پا سکتا کیونکہ جیسا کہ میں پہلے ہی آپ کو بتا چکا ہوں کہ کوئی کمیٹی یا ادارہ مجھے بااختیار عہدہ دیے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ سو میں اپنی شخصیت کے اس پہلو سے خوب فائدہ اٹھا رہا ہوں۔

ادھر کچھ دنوں سے فضا میں کچھ ردّوبدل ہو رہا ہے ویسے آپ مطمئن رہیں موسم کے تغیر و تبدل کا میری صحت (جو اب اچھی نہیں رہتی) اور کاروبار پر کوئی اثر نہیں پڑنے والا۔ ہاں کچھ حاسد ضرور پیدا ہو گئے ہیں لیکن وہ بھی ایک حد سے آگے نہیں جا سکتے۔ نئی نسل میں کچھ چالاک افراد بھی موجود ہیں اور وہ اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مارنے لگے ہیں کہ شاید انھیں بھی کوئی چھوٹی موٹی کرسی مل جائے۔ لیکن ایسے لوگ بھی میری سرپرستی ہی میں کچھ کر پاتے ہیں ان نوجوانوں کے سامنے معقول تصرف کے ساتھ داغ کا ہوتا ہے۔

مسند کا انتظار کرے کون حشر تک
پیڑھا بھی گر ملے تو روا ہے شباب میں

سو ان میں سے کسی کسی کو میں کہیں کہیں ایک آدھ پیڑھا دلوا دیا کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتا ہوں "بیٹا میرا یہ احسان یاد رکھنا۔ تم بہر حال میری بلی ہو لہٰذا میرے سامنے میاؤں کرنے کی کبھی کوشش نہ کرنا ورنہ دنیا و عاقبت دونوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔"

میں اپنی گفتگو ختم کرنے سے پہلے میں ایک بار پھر آپ کو یہ بتا دوں کہ میں نے اردو کے لیے کبھی کچھ نہ کیا۔ جو کچھ کیا سب اپنے لیے کیا۔ اگر کہیں اردو کے لیے کچھ کرنے کی بات آئی بھی تو میں نے اسے ٹال دیا۔ کسی کی کیا مجال کہ میرے تیور دیکھنے کے بعد میرے سامنے زبان کھولنے کی جرأت کرے۔ پھر

(باقی ص۲۱ پر)

ب-۱

کتابوں کی باتیں

کچھ نئی اور کچھ پرانی مطبوعات

موصولات برائے تبصرہ

کتاب آڑی ترچھی لکیریں
افسانہ نگار۔ ستیش بترا
سن اشاعت: ۱۹۷۸ء
قیمت: ۱۰ روپئے
سائز: ۲۰×۳۰/۱۶
ناشر: پنجابی پستک بھنڈار۔ دہلی ۶

• • •

کتاب: پتھریلی آوازیں
شاعر: اقبال انصاری
سن اشاعت: ۱۹۸۳ء
قیمت: درج نہیں
سائز: ۲۰×۳۰/۱۶
ناشر: ۱۷۶ F پانڈو نگر، پٹپڑ گنج روڈ۔ دہلی ۹۲

• • •

تازہ رسائل: ماہنامہ اسباق۔
شمارہ: ستمبر-اکتوبر ۱۹۸۳ء
مدیر: نذیر فتحپوری
سائز: ۲۰×۳۰/۸
صفحات: ۲۶ روپئے
قیمت: ۳ روپئے
طباعت: آفسٹ
دو مضامین
تین افسانے
۱۶ غزلیں
۴ نظمیں
ناشر: ۸۳ ایروڈا۔ پونہ ۶

• • •

کتاب: بہار میں اردو تنقید
ناقد: ڈاکٹر اعجاز علی ارشد
سن اشاعت: ۱۹۸۱ء
قیمت: پندرہ روپئے
صفحات: ۱۱۲
سائز: ۱۸×۲۲/۸
ناشر: بک امپوریم - سبزی باغ پٹنہ ۴

• • •

کتاب: شب ریزے
شاعر: ڈاکٹر اختر نظمی
سن اشاعت: ۱۹۸۲ء
قیمت: ۱۳ روپئے
صفحات: ۹۶
سائز: ۱۸×۲۲/۸
ناشر: مدھیہ پردیش اردو اکادمی - بھوپال

• • •

کتاب: کاغذ کی دیوار
افسانہ نگار: ہیرانند سوز
سن اشاعت: (درج نہیں)
قیمت: دو روپئے پچاس پیسے
سائز: ۲۰×۳۰/۱۶
ناشر: ہیرانند سوز۔ فرید آباد

• • •

ماہنامہ نمائندہ نئی نسلیں
جون ۱۹۸۳ء
شمارہ: ۱۶
مدیر: م نسیم
قیمت: پندرہ روپئے
سائز: ۱۸×۲۲/۸
صفحات: ۱۷۶
طباعت: آفسٹ
کاغذ: عمدہ سفید
مضامین: تین
نظمیں: سات
تمثیل: ایک
غزلیں: اٹھارہ
افسانے: سات
افغانستان کے تعلق سے چھ - تحریریں
سات کتابوں پر تبصرے
ناشر: ۸۴۴۴۲ بارہ دری - شیر افگن - دہلی ۶

• • •

ششماہی ابلاغ
۱۹۸۲ء
شمارہ: ۳-۴
مدیر: احمد سجاد
قیمت: ۱۵ روپئے
صفحات: ۱۷۶
سائز: ۱۸×۲۲/۸
طباعت: لیتھو
کاغذ: سفید
مضامین: چھ
افسانے: پانچ
نظمیں: چھ
غزلیں: بارہ
تبصرے: چار

• • •

ماہنامہ شاعر
شمارہ ۴ — ۱۹۸۳ء
مدیر: افتخار امام صدیقی
قیمت: تین روپئے پچاس پیسے
صفحات: ۷۴
سائز: ۲۰×۳۰/۸
گوشہ بشیر بدر - پانچ مضامین
انٹرویو - ایک
مقالات: دو
نظمیں: تین
کہانیاں: چار
سیاحت نامہ: ایک
غزلیں: تیرہ
مکتوبات: چار
ناشر: قصر الادب پوسٹ بکس نمبر ۵۲۶ بمبئی

اردو ۱۹۸۳ء
مرتب: نند کشور وکرم - سال اشاعت ۱۹۸۳ء
اس میں ۱۹۸۲ء کی منتخب کہانیاں، غزلیں، نظمیں، مضامین کے علاوہ ادیبوں، ناشروں، کتب فروشوں، لائبریریوں، اخبارات و رسائل اور اعزازو انعامات کی تفصیلات بھی شامل ہیں۔

راجونت سنگھ رانا

کیا سکھ مُسلم دُشمن ہیں؟

سکھ دھرم انسانی برادری کی برابری اور عوامی بہتری وبہبودی کا ترجمان ہے۔

آر۔ایس۔ایس۔ سکھ نوجوانوں میں فرقہ پرستی اور مسلم دُشمنی کا زہر کس طرح پھیلا رہا ہے۔ اسکی ایک مثال مجھے میرے ایک دوست جناب انیس احمد نے سنائی۔ وہ عیدالفطر کے موقعہ پر اپنے گاؤں ہرپال پور واقع مدھیہ پردیش گئے۔ لڑکوں کے ایک گروہ میں انہیں ایک سکھ لڑکا دکھائی دیا۔ اسے بُلا کر انہوں نے ازراہ تجسس پوچھا۔ تم بھی دوسرے لڑکوں جیسے کیوں نہیں بن جاتے۔؟

وہ لڑکا کچھ دیر انہیں گھورتا رہا پھر بولا "جب تک تم ... مسلمانوں کو بھارت سے نکال نہیں لیتا۔ اُس وقت تک میں اپنے بال قائم رکھوں گا۔ دوسروں کی طرح بننا پھر دیکھا جائے گا۔"

جناب انیس احمد کی بات نے مجھے ذہنی طور پر پریشان ضرور کر دیا۔ لیکن غیر مبہم طور پر میں مسئلہ کو سمجھ نہ سکا۔ سکھ دھرم اور مسلم دشمنی دو ایسے مسئلے ہیں۔ جنہیں ایک دوسرے کے تعلق سے ہی جانا جا سکتا ہے۔ میں نے انیس احمد سے کہا۔ "اگر سکھ مسلم کش یا مسلم دشمن ہوتے۔ تو ظاہر ہے کہ میری اور آپ کی دوستی نہ ہوتی۔"

"لیکن اُس لڑکے کی طرح آپ آر۔ایس۔ایس کی شاخ میں تو نہیں جاتے۔ پھر مسلم دشمن کیسے ہو سکتے ہیں۔"

انیس کی اس دلیل نے میرا ذہن بالکل صاف کر دیا۔

وہ لڑکا ایک ایسے گاؤں میں رہتا ہے جہاں صرف اس کا خاندان ہی سکھ خاندان ہے۔ ظاہر ہے کہ سکھ دھرم اور سکھ تواریخ سے اسے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ اور آر ایس۔ایس کے فلسفے جس کی بُنیاد ہی مسلم دُشمنی ہے۔ نے اُسے ذہنی طور پر غلط قدر و قیمت کا مالک بنا دیا ہے۔

میں نے انیس احمد سے کہا۔ کہ کیا وہ بھی اس لڑکے کے خیالات کو ہی درست سمجھتے ہیں یا انہیں سکھ دھرم کے متعلق کچھ واقفیت ہے؟

انہوں نے کہا۔ مجھے ایک طرح سے سکھ دھرم و تاریخ سے لاعلم سمجھے اور صرف مجھے ہی نہیں بتایئے۔ بلکہ لکھ کر دیجئے: تاکہ میرے جیسے دوسرے لوگ بھی بنیادی باتیں تو سمجھ سکیں۔

سکھ دھرم کے متعلق اس مضمون میں میں دو پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر کچھ باتیں اختصار سے کروں گا۔ اور وہ دونوں پہلو ہیں سکھ گوروؤں کے کلام میں مسلم مذہب کے بارے میں ملتے اشارات اور سکھ تواریخ میں ملتی کچھ مثالیں۔

شری گورونانک دیوجی کی بانی (کلام) میں مسلمانوں کے متعلق کچھ اشارات ملتے ہیں۔ اُن کے کلام میں سے مندرجہ ذیل مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جن میں مسلم دھرم کو وہ سماجی تعلق اور سماجی استعاروں سے پیش کرتے ہیں۔

مہر مسیت صدق مصلیٰ حق حلال قرآن
سرم سنت سیل روزہ ہو ہو مسلمان
کرنی کعبہ سچ پیر کلمہ کرم نواج
تسبیح سا اس بھاوسی نانک رکھے لاج

(اگر مسجد محبت کی ہو۔ صدق کا مصلیٰ ہو حق و حلال کو قرآن کا درجہ دیا جائے۔ محنت سنت ہے اور نفس کشی روزہ ہو۔ تبھی مسلمان بنا جا سکتا ہے۔ انسان کے اعمال کعبہ کا درجہ رکھیں۔ اور سچائی مذہبی راہنماؤں کا درجہ تعظیم حاصل کرے۔ کلمہ اور نماز مہربانی ہوں۔ ایسی تسبیح اس خداوند کریم کو اچھی لگیگی اور نانک عرض کرتے ہیں۔ کہ ایسی حالت میں وہ خدا انسان کی عزت و ناموس کا تحفظ کرے گا۔)

ایک سچے مسلم کردار کی، سماجی تعلق سے۔ ایسی خوبصورت تصویر گورونانک ہی چند الفاظ میں پیش کر سکتے ہیں۔ جن کا دل و دماغ مسلم دشمنی سے نہیں۔ بلکہ سچے مسلمان کی محبت سے بھرا ہوتا ہے۔ ایک اور جگہ گورُو نانک نے اپنی بانی میں لکھا ہے۔

پنج نواجاں وخت پنج۔ پنجاں پنجے ناؤ
پہلا سچ۔ حلال دوئے۔ تیجا خیر خدائے
چوتھی نیت راس، پنجویں صفت ثنائے
کرنی کلمہ آکھ کے تاں مسلمان سدائے
نانک جیتنے کوڑ آر۔ کوڑو کوڑی پائے

(مسلم مذہب میں پانچ نمازیں ہیں انہیں ادا کرنے کے پانچ وقت مقرر ہیں۔ اور پانچوں نمازوں کے پانچ ہی نام ہیں۔ گورونانک کے خیالات کے مطابق عملی کردار کے مدنظر پہلی نماز سچائی کا حصول ہے۔ حق و حلال کی کمائی پر گذر بسر کرنا دوسری، ساری کائنات کی خیر و عافیت کے لئے دعا گو ہونا۔ تیسری، اپنی نیت کو درست رکھنا (دغا و فریب اور دوسری برائیوں سے دور رہنا) چوتھی۔ اور اُس خدائے کریم کے صفت و ثنا کرنا۔ پانچویں نماز ہے۔ اور پھر بھلے اعمال یہ انسانی برادری کی بہتری و بہبودی کے متعلق کاموں کو کلمے کی جگہ دی جائے۔ تبھی مسلمان کہلایا جا سکتا ہے۔ نانک کہتے ہیں۔ جو مندرجہ بالا نظریات سے ہٹ کر کچھ کہتے ہیں تو وہ جھوٹ ہے اور جھوٹوں کے پلے جھوٹ کے سوا کچھ نہیں پڑ سکتا۔

نصف دوم

یہی نہیں ۔ گورو گوبند سنگھ جی کے بعد جس آدگورو گرنتھ صاحب کو گورو گدی دی گئی ۔ اور جسے آج دنیا بھر کے سکھ اپنا گورو مانتے ہیں ۔ اُس میں تین مسلمان صوفیوں سنتوں کی بانی (کلام) بھی درج ہے ۔

یہ تمام باتیں ظاہر کرتی ہیں ۔ کہ سکھوں کی اسلام دشمنی یا مسلم کُشی کی بات کرنا انتہائی ناسمجھی ہے ۔ بلکہ یہ آر ۔ ایس ۔ ایس کے پراپیگنڈہ کے شکار ناسمجھ سکھ بچے ہی ایسا کہہ سکتے ہیں ۔ عام سِکھ تو اسے سوچ بھی نہیں سکتا ۔

یہی نہیں ۔ آج کے باشعور لوگ ، جب سکھ تحریک کا بھرپور تجزیہ کرتے ہیں ۔ تو اس نتیجہ پر پہنچے بنا نہیں رہ سکتے کہ سکھ گوروؤں کا کلام کسانوں ۔ محنت کشوں ، اور چھوٹے دُکانداروں کے جذبات و تصورات کا ترجمان ہے ۔ اور اگر اُس میں کسی طبقہ کی مخالفت کی جھلک نظر آتی ہے ۔ تو وہ ہے راجاؤں ، تعلقہ داروں اور مذہبی طور پر لوٹ کھسوٹ کرنے والے براہمنوں اور ملّاؤں اور زناجیوں کے طبقات کی ۔

گورو نانک نے اپنی زبان میں لکھا ہے ۔

نیچاں اندر نیچ جات ، نیچی ہوں اَت نیچ
نانک تن کے سنگ ساتھ ۔ وڈیاں سوں کیا ریس

(میں سب سے نیچی ذات کے لوگوں میں سے ہوں ۔ اور میں انہیں لوگوں کے ساتھ ہوں ۔ میرا بڑے لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں اور نہ ہی میں ان کے طور و اطوار کی نقل کرنے کے لئے کبھی تیار ہوا ہوں ۔)

مسلم ممالک کا سفر اختیار کرنا اور مکہ شریف تک جا پہنچنا ۔ کیا یہ ثابت نہیں کرتا کہ شری گورو نانک دیو جی اسلام کے بھرپور واقفی و جانکاری کے لئے کوشاں تھے ۔ فارسی و عربی کی تعلیم انہوں نے بچپن میں حاصل کی تھی ۔

گورو گوبند سنگھ کے پانچ پیاروں میں سے ایک جاٹ تھا ۔ اور وہ بھی تھوڑی زمین والا ۔ اور باقی چاروں نیچی ذاتوں میں سے تھے

دراصل سکھ گورو ذات پات کے تمیز کے مخالف تھے ۔ اس لئے چھوٹی جاتیوں کے لوگوں اور سبھی باشعور لوگوں کی حمایت انہیں حاصل تھی ۔

شری گورو امرداس (تیسرے سکھ گورو) نے جن اپنے معتقد ۲۲ لوگوں کو مختلف علاقوں کے سربراہ مقرر کیا ۔ ان میں ایک مسلم اللہ یار خاں تھے جن کے ذمہ اپنے اپنے علاقوں میں سکھ گوروؤں کے خیالات و نظریات کا پرچار کرنا تھا ۔ اور معتقد لوگ جو روپیہ اور سامان اظہارِ عقیدت کے طور پر بھینٹ کرتے تھے ۔ مقامی اخراجات کے کم کرنے کے بعد باقی رقم و سامان گوروں تک پہنچانا ہوتا تھا ۔

شری گورو ارجن دیو جی نے امرتسر کے دربار صاحب کی بُنیادی اینٹ بھی سائیں میاں میر سے رکھوائی تھی ۔ جو اس زمانے کے مشہور صوفی فقیر تھے ۔ اور لاہور چھاونی میں رہائش پذیر تھے ۔ جنہیں مغل بادشاہ جہانگیر اور نورجہاں تک عقیدت کی نظروں سے دیکھتے تھے ۔

سکھ گورو چونکہ کسانوں ، کاریگروں بے زمین مزدوروں اور باشعور لوگوں کے ترجمان تھے ۔ اس لئے راجاؤں یا شہنشاہوں سے ان کی مخالفت یا دشمنی کی بات سمجھ میں آسکتی ہے ۔ شری گورو ارجن دیو جی کی شہادت سے پہلے ہی ۔ اس بڑھ رہی عوامی تحریک سے خائف ہو کر جہانگیر نے تزکِ جہانگیری میں لکھا تھا ۔

"دریائے بیاس کے کنارے گوئندوال میں گورو نانک کے پیروؤں کی ایک گدی چلی آرہی ہے ۔ جس کے معتقدوں میں ہندوؤں کے علاوہ کچھ بیوقوف مسلم بھی شامل ہو چکے ہیں ۔ کئی سالوں سے میں اس بات پر غور و خوض کر رہا ہوں کہ اس جھوٹی دکانداری کو ختم کردوں یا گورو کو اسلام کے دائرہ میں لے آؤں ۔"

شہنشاہ جہانگیر اور اس کے حواریوں سے دشمنی ۔ بھلے ہی گورو صاحبان کی نہیں ہو ۔ اس تحریک کو وہ اپنے لئے خطرناک ضرور سمجھنے لگے تھے ۔ تبھی تو جہانگیر نے مندرجہ بالا رائے قائم کی تھی ۔

شری گورو گوبند سنگھ نے جتنے بھی جنگ لڑے ۔ اُن میں ان کے مخالف بائی دھار کے (پہاڑی ریاستوں کے) ہندو راجاؤں نے لڑائی کی پہل کی ۔ بات بالکل صاف ہے شری گورو تیغ بہادر صاحب والد شری گورو گوبند سنگھ جی نے ماکھے خاں سے زمین خرید کر وہاں نانکی چک اپنی والدہ محترمہ کے نام پر بسایا تھا ۔ یہ زمین کہلور کے راجہ بھیم چند کی ریاست میں واقع تھی ۔ شری گورو گوبند سنگھ جی نے اپنے پیروؤں کو فوجی ٹریننگ دینا شروع کی ۔ راجاؤں کی طرح انہوں نے کلغی لگانی شروع کر دی ۔ اس سے بھیم چند خائف ہو گیا اور اندر ہی اندر شری گورو جی کو اپنے زیر اثر لانے کے منصوبے بنانے شروع کئے ۔

آسام کے راجہ رتن دیو نے ایک خوبصورت ہاتھی جس کو گورو جی نے پرسادی کا نام دیا ۔ گورو صاحب کو بھینٹ کیا ۔ اس نے ایک ایسا مشینی ہتھیار دیا جس میں پانچ ہتھیار یک مست چلائے جا سکتے تھے ۔ افغانستان کے معتقدوں نے ایک شاندار پشمینے کا شامیانہ دیا ۔ ان سب کو دیکھ کر بھیم چند برداشت نہ کر سکا ۔ ان سب اشیاء کو ہتھیانے کے لئے اس نے اپنے لڑکے کی شادی کے لئے طلب کیا تھا ۔ لیکن گورو صاحب نے انکار کر دیا ۔

اور پھر اس نے گورو صاحب پر چڑھائی کر دی اور منہ کی کھائی ۔ انہیں ہندو راجاؤں نے مغل حکمرانوں کے پاس گورو صاحب کی شکایت کی ۔ اور گورو جی کی بڑھ رہی قوت سے انہیں آگاہ کیا ۔ اور اپنی مدد کے لئے ان سے درخواستیں کیں ۔

جن جنگوں میں مغل یا پٹھان فوجیں

بقیہ خواتین کا مشاعرہ

فیض نشان۔ لکھنؤ پر شاعرہ بھی کیا کرتی تھیں۔

رات کو آئیں گے ہم صاف معمہ یہ ہے
وعدہ وصل کیا اس دکھا کے گیسو

دلہن دلہن بیگم نام زوجہ نواب آصف الدولہ

بہ چلے پھوٹ کے آنکھوں سے آبلہ دل کا
تری کی راہ سے جاتا ہے قافلہ دل کا
ایسے کم ظرف نہیں ہیں جو بہکتے جائیں
گل کی مانند جدھر جائیں مہکتے جائیں

سلطان نام سلطان بیگم دختر نواب معتمد الدولہ بہادر لکھنوی یہ صاحب دیوان تھیں۔

تھی وہ نگاہ یا کوئی ناوک کا تیر تھا
ملتے ہی آنکھ رہ گیا کہہ کے ہائے دل

عشرت نام عشرت محل نواب اودھ کے محل سے

گرمی عشق مانع نشو و نما ہوئی
میں وہ نہال تھا کہ اگا اور جل گیا

فاطمہ بیگم آگرہ کی رہنے والی۔

نازک دماغ وہ ہیں تو ہے یاں بھی تمکنت
ہم خود بھی ایسے ہیں کہ منایا نہ جائے گا۔

کنیز فاطمہ بیگم نام۔ نصرت الدولہ کی بیٹی

نقاش نے اس بت کا مرے نقش جو کھینچا
ساعد پہ نہ پہنچا تھا کہ جو ہاتھ کو کھینچا۔

بقیہ من کہ قبلۂ اردو

بھی کچھ گستاخ قسم کے لوگ کہیں کہیں زبان کھولنے لگے ہیں لیکن اس سے مجھے فی الحال کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ کیونکہ "ہنوز دلی دور است"! اب بھی ہر محفل میں میرِ محفل میں ہی ہوتا ہوں۔ کوئی مسند پر بٹھاتا ہے اور کوئی سر آنکھوں پر۔ میری اہمیت اور عظمت کا سورج اب تک نصف النہار پر ہے اور انشاء اللہ جب تک زندہ رہوں گا اردو کا چشمۂ فیض میرے لیے جاری رہے گا۔ اب تک اس کے الطاف و کرم سے میں کامیابی کی منزلیں طے کرتا رہا ہوں بخدا اگر اس کا سہارا نہ ملا ہوتا تو میں اب تک کسی دفتر کے فائلوں سے دست و گریباں ہو کر رٹائر ہو چکا ہوتا۔ اس زبان کے مستقبل کے بارے میں تو اب کچھ کہنا میرے بس کی بات نہیں کہ ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے اور اردو یہاں کی پندرہ قومی زبانوں میں سے ایک ہے۔ لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس کے ہاتھوں میرا مستقبل انتہائی شاندار اور تابناک ہے کہ میں ناقابلِ تسخیر "قبلۂ اردو ہوں!!

بقیہ کیا سکھ مسلم دشمن ہیں؟

شامل ہوئیں۔ ان میں بھی اُنہیں جیت کہیں نہیں ہوئی۔ حالات کی مجبوری میں گورو جب جب شاہی فوجوں کے مقابلے سے ہٹنے پر مجبور ہوئے۔ تب بھی ان کے مسلم دوستوں اور معتقدوں نے ان کی مدد کی۔ اور بعد میں شاہی عتاب کے وہ شکار بھی ہوئے ان میں سڈھورہ کے پیر بدھو شاہ بھی تھے جن کے دو لڑکے اور سات سو مرید۔ گورو گوبند سنگھ کی طرف سے لڑتے ہوئے بھنگانی سی جنگ میں شہید ہو گئے۔

نظریاتی طور پر سکھ گورو کسانوں۔ کاریگروں اور دوسرے محنت کشوں کے ترجمان تھے۔ انسانی برادری کی اُخوت اور بہتری و بہبودی ان کے مذہبی فریضہ میں شامل تھیں۔ ذات پات کے وہ زبردست مخالف تھے۔ مذہبی رواداری ان کا ایمان تھا۔ کمزور طبقات کو انہوں نے اپنا ساتھی بنایا۔

ایسی حالت میں اگر انیس احمد خاں جیسے لوگ اس سکھ بچے کے غلط ذہنی جھکاؤ سے دکھی ہیں۔ تو میرے جیسے لوگ اس طرز خیال کو ملک دشمن خیال کرتے ہیں۔

اسی ذہنی پریشانی کا نتیجہ یہ مضمون ہے جو مختصر طور پر سکھ دھرم و تاریخ کو پیش کرتا ہے۔ اگر اس سے کچھ حد تک بھی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو گیا تو میں سمجھوں گا کہ آج کی ملکی ضرورت "قومی اتحاد" کو پورا کرنے میں بھی میں نے اپنا حصہ ڈالا ہے۔

اردو ۱۹۸۳

مرتب:۔ نند کشور وکرم

○ ۱۹۸۲ء کے افسانوں کا انتخاب ○ ۱۹۸۲ء کی غزلوں کا انتخاب
○ ۱۹۸۲ء کی نظموں کا انتخاب ○ ۱۹۸۲ء کے مضامین کا انتخاب

اور

○ ۱۹۸۲ میں گزرنے والوں پر مضامین
○ ۱۹۸۲ میں اردو کی سرگرمیوں کی رپورٹ

ناشرین ― ادیبوں ― کتب فروشوں ― اور لائبریریوں کیلئے
اعزازات و انعامات کی تفصیلات
اخبارات و رسائل کی تفصیلات اور پتے ― ایک اردو انسائیکلوپیڈیا
قیمت ۸۰ روپیے۔ چنگاری کے قارئین کے لئے خاص رعایت
ملنے کا پتہ:۔ چنگاری ۳/۱۰۔ ۱۰۱۴ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲

چالیس ادیبوں کی منتخب مزاحیہ اور طنزیہ تخلیقات پر مشتمل

کالم نگار نمبر

نہ صرف ڈیڑھ سو سال کی تاریخ، صحافت، اور سماجی و سیاسی نشیب و فراز کی دلچسپ داستان پیش کرتا ہے۔

بلکہ اردو زبان کی زبردست قوتِ بیان اور اردو ادیبوں کے جرأت اظہار کی بہترین عکاسی بھی کرتا ہے۔

فوٹو آفسٹ کی طباعت کے ساتھ تصاویر سے مزیّن۔

چند فن کار: منشی سجاد حسین۔ رتن ناتھ سرشار۔ منشی جوالا پرشاد برق۔ خواجہ حسن نظامی۔ حاجی لق لق۔ عبدالمجید سالک۔ ملا رموزی۔ ساگر چند گورکھا۔ چراغ حسن حسرت۔ قاضی عبدالغفار۔ شوکت تھانوی۔ کنھیا لال کپور۔ ابراہیم جلیس۔ تخلص بھوپالی۔

مرتب: فکر تونسوی۔ پانچ سو صفحات۔ قیمت صرف ۱۰ روپئے۔ چنگاری کے خریداروں کو خصوصی رعایت۔

چنگاری ۳/۱۴۱۰ رام نگر شاہدرہ دہلی نمبر ۳۲

چنگاری کے **غزل نمبر** سے پہلے بھی کئی رسائل کے غزل نمبر شائع ہوئے ہیں

مگر چنگاری کا غزل نمبر ان تمام نمبروں سے مختلف اور منفرد ہوگا۔

اس نمبر میں کلاسیکی شعرا کی غزلوں کا انتخاب تو ہوگا ہی۔

مگر اہم ترین حصہ ان غزل گو شعرا کی غزلوں کے انتخاب پر مشتمل ہوگا جو ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک نمایاں ہوئے۔

اس سے بھی اہم حصہ ان غزل گو شعرا کی غزلوں کے انتخاب پر مشتمل ہوگا جو تقسیم ملک کے بعد نمایاں ہوئے۔

تمام نئے، پرانے غزل گو شعرا کے سوانحی خاکے کے علاوہ ان کی غزل گوئی پر مختصر مضامین ہوں گے۔

غزل میں کلاسیکی، نئے، جدید اور جدید ترین رجحانات، اور تجربات پر مضامین ہوں گے۔

غزل کی تاریخ، اس کی اہمیت، اس کے ارتقا، دوسری زبانوں میں اس کی مقبولیت پر مضامین ہوں گے۔

تمام غزل گو شعرا کی دستیاب اور نایاب تصاویر ہوں گی۔

یہ نمبر قارئین اور غزل کے شائقین کے لئے تو اہم ہوگا ہی۔

طلبا کی درسی ضروریات کی بھی تکمیل کرے گا۔

اگر آپ غزل کہتے ہیں تو اپنی پانچ غزلیں، تصویر اور بایوڈاٹا ارسال کیجئے۔

پندرہ روزہ چنگاری ۳/۱۴۱۰ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲

Regd. No. D (E) 49 Price Rs- 2- 00

۵۰ روپے کی خصوصی رعایت

★ پندرہ روزہ چنگاری ایک ایسا رسالہ ہے جسے خاص و عام دونوں حلقوں میں مقبولیت حاصل ہے۔ اس کے ایک شمارہ کی قیمت ۲ روپے اور زرِ سالانہ ۴۵ روپے ہے۔

★ راجندر سنگھ بیدی نمبر کی قیمت ۶۵ روپے ہے۔

★ سعادت حسن منٹو (ایک نفسیاتی تجزیہ) کی قیمت ۳۰ روپے ہے۔

★ لوکاچ اور مارکسی تنقید مصنفہ اصغر علی انجینیئر، کی قیمت ۳۰ روپے ہے۔

چنگاری، منٹو، بیدی اور لوکاچ کی مجموعی قیمت ۱۷۰ روپے ہوتی ہے۔ اگر آپ ہمیں ۱۲۰ روپے ارسال کر دیں تو بیدی نمبر، منٹو اور لوکاچ آپ کو بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک بھیج دیا جائے گا اور ایک سال کے لیے چنگاری آپ کے نام جاری کر دیا جائے گا۔

اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ

★ اگر آپ پندرہ روزہ چنگاری یا ماہنامہ عصری آگہی کے سالانہ خریدار ہیں تو آپ کو ہر کتاب کی خریداری پر پندرہ سے بیس فیصد کمیشن دیا جائے گا چاہے آپ ہمارے ادارے کی کتاب خریدیں یا ہمارے توسط سے کسی دوسرے ادارے کی کتاب۔

عصری آگہی پبلی کیشنز، ۱۳۱۰/۳ - رام نگر، شاہدرہ دہلی ۳۲